سہ ماہی کتابی سلسلہ

قندیلِ سلیمان

۱۱

جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء

خانقاہِ معلّٰی حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی، مکھڈ شریف (اٹک)

کتب خانہ حضرت مولانا محمد علی مکھڈی رحمۃ اللہ علیہ کے چند مناظر

11

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہ ماہی مجلّہ

جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء

قندیلِ سلیمان

مکھڈ شریف (اٹک)

بفیضانِ نظر: شہبازِ چشت حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسویؒ

بیادگار: حضرت مولانا محمد علی مکھڈیؒ، مکھڈ شریف

زیرِ سرپرستی: حضرت مولانا فتح الدین چشتی مدظلہ العالی

مدیر: محمد ساجد نظامی

مدیرِ منتظم: ڈاکٹر محمد امین الدین

مدیرِ معاون: محسن علی عباسی

ہدیہ سالانہ پانچ سو روپے

فی شمارہ 150 روپے

سرکولیشن منیجر: فدا حسین ہاشمی　سرورق اینڈ کمپوزنگ: یاسر اقبال، اسلام آباد　تصاویر: محمد زاہد محمود

پرنٹرز/ پبلشرز:۔ نظامیہ دارالاشاعت خانقاہِ معلی حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی، مکھڈ شریف، (اٹک)

فون: 0334-8506343, 0343-5894737, 0346-8506343, 0333-5456555

ای میل: sajidnizami92@yahoo.com

فہرستِ مندرجات

☆ اداریہ	مدیر	۵

گوشۂ عقیدت:

☆ مناجات	حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسویؒ	۷
☆ سلام بحضور سرورِ کائنات ﷺ	فیض محمودی تونسویؒ	۸
☆ سرمایۂ الہام	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	۱۰
☆ منقبت حضرت خواجہ فخر جہاں دہلویؒ	حافظ محمد بخش سیالوی	۱۲
☆ منقبت حضرت قبلۂ عالم خواجہ نور محمد مہارویؒ	حافظ محمد بخش سیالوی	۱۳

خیابانِ مضامین:

☆ خلفاء راشدین کے باہمی تعلقات اور محبتیں	علامہ قاری سعید احمد	۱۴
☆ تذکرۂ اولیائے چشت	مولوی محمد رمضان مغیثی تونسوی	۱۸
☆ ملفوظات نگاری: چند فکری اور فنی مباحث	ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر	۳۳
☆ کتب خانہ مولانا محمد علیؒ مکھڈی	محمد ساجد نظامی	۴۶
☆ حضرت علامہ حافظ محمد احسن المعروف حافظ دراز	حافظ محمد بخش سیالوی	۵۵
☆ تذکرہ اساتذہ کرام درس گاہ حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی	علامہ حافظ محمد اسلم	۶۰
☆ انوار الکریمین	پروفیسر محمد انور بابر	۶۶
☆ حاضریٔ رسول ﷺ	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	۷۱
☆ پیغام اقبال	علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ	۸۰
☆ ڈاکٹر انور سدید بے مثال ادیب	قمر زمان	۸۱

حدیقۂ شریعت:

☆توحیدِ خالص — حضرت خواجہ غلام زین الدینؒ — ۸۸

☆اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا — علامہ بدیع الزماں نوریؒ — ۹۳

❁ ❁ ❁

صلی اللہ علیہ وسلم

اداریہ

غریب وسادہ ورنگیں ہے داستانِ حرم

نہایت اُس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

ذوالحجہ ۱۴۳۷ھ ہم سے جدا ہوگا اور پھر محرم الحرام ۱۴۳۸ھ کا آغاز ہوگا۔ اسلام کی ابتداوانتہا قربانیوں کی لازوال داستانوں سے مزین ومنور ہے۔ یہ قربانیاں ہمیں ایک پیام ابدی کا درس سناتی ہیں؛ کہ زندگی چندروزہ ہے اس میں صرف اس چندروزہ زندگی کے لیے اپنے شب و روز کو وقف کر دینا اور اُس ذاتِ والاصفات کو بھول جانا جو اس کائنات کی خالق و مالک اور رازق ہے کتنا بھول پن ہے۔ ہم اُس ذاتِ والاصفات کے ساتھ جتنا رشتہ کمزور کرتے جائیں گے، اتنا ہی ہم مسائل میں گھرتے چلے جائیں گے؛ اور یہ تعلق اور رشتہ جتنا مضبوط ہوگا؛ اتنا ہی ہم خوشحال ہوں گے۔ یہ خوشحالی جسم وروح اور معاشرے میں حسنِ انتظام کی صورت میں ہر طرف دکھائی دے گی۔ اللہ رب العزت کے ساتھ اس کمزور تعلق کو مضبوط بنانے کے لیے جو راستہ اسلاف نے ہمیں بتایا وہ مولانا رومؒ کی زبانی سنیے۔

یک زمانہ صحبتِ با اولیا

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

یہ کمزور تعلق کیسے مضبوط ہوگا؟ صحبتِ اولیا سے؛ اولیائے کاملین کی تربیت سے کتنے ہی گرے پڑے ذرے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کا فرمانِ ذیشان ہے کہ "صحبت کا اثر قوی ہوتا ہے۔"

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد

وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

الحمد اللہ ''قندیلِ سلیماں'' کا گیارہواں شمارہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ سہ ماہی کتابی سلسلہ ۲۰۱۳ء میں شروع کیا گیا تھا۔ آج ۲۰۱۶ء تک کا تین سالہ سفر اس نے بخوبی طے کیا۔ یہ شمارہ چونکہ سلاسلِ تصوف کے بزرگوں کے احوال و ملفوظات کو بالعموم اور سلسلہ چشت کے صوفیا کی تعلیمات کو بالخصوص قارئین کے لیے پیش کرتا ہے۔ اس لیے آپ کو اس شمارے میں منثور و منظوم مناقب اور صوفیا کی مجالس کے وہ احوال اور خوش آثار لحات کی روداد یں پڑھنے کو ملتی ہیں جن سے بے قرار روحوں کو قرار ملتا ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں جناب ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر کا مضمون ''ملفوظات نگاری: چند فکری و فنی مباحث'' خاصے کی چیز ہے۔ ''انوار الکریمین'' کے نام سے منسوب پروفیسر محمد انور بابر کا سفر نامۂ حج جذب و کیف کی عجب حسیں داستان ہے؛ جو ان شاء اللہ قسط وار شائع ہوگا۔ دیگر مضامین میں سابقہ موضوعات کا تسلسل ہے۔ اللہ رب العزت سے دست بہ دعا ہیں کہ یہ روشنیوں کا سلسلہ یونہی قائم و دائم رہے۔ آمین

مدیر

☆☆☆☆

مناجات

حضرت شاہ محمد سلیمان تونسویؒ

یا الٰہی ! عفو کن تقصیر ما
نیست جز تو کو کنند تدبیر ما

دستگیری کن مرا یا دستگیر
زآنکہ جز تو نیست مارا دستگیر

کس نہ گشتہ از درِ تو نامید
اے امیدو ، اے امیدو ، اے امید

چوں سلیمانم بکردے اے کریم
حفظِ ایماں کن زِ شیطانِ رجیم

۱۔ یاالٰہی ہماری تقصیروں کو معاف فرما۔ تیرے بغیر کون ہے جو ہمارے حق میں بہتر تدبیر فرمائے۔

۲۔ اے ہمارے دستگیر ہماری دستگیری فرما۔ آپ کے بغیر کوئی بھی ہماری دستگیری فرمانے والا نہیں ہے۔

۳۔ آپ کے درِ اقدس سے کبھی کوئی نا اُمید نہیں گیا۔ اے ہماری امید، اے ہماری امید، اے ہماری امید۔

۴۔ جس طرح آپ نے اپنی کریمی سے مجھے سلیمانی عطا کی ہے۔ اسی طرح شیطانِ رجیم سے ہمارے ایمان کی حفاظت فرما۔

☆☆☆

سلام بحضور سرورِ کائنات ﷺ

فیض محمودی تونسویؒ

مژدہ ہو خلق خوش نصیب
تیرے نصیب ہیں عجیب
رحمتِ حق کا ہے نزول
عرش سے آگئے حبیب

لاکھوں سلام آپ پر صلِ علیٰ محمد

گلشنِ زیست کے شمیم
فخر اور نازشِ کلیم
دونوں جہاں کے مختیار
بطحائے پاک کے یتیم

آقائے روح بحر و بر صلِ علیٰ محمد

زینتِ تاج علم و دیں!
مالکِ حشمتِ متیں
سارے جہاں کے خوبرو
کتنی ہے شان تو حسیں

اللہ رے ضوئے حسن ور صلِ علیٰ محمد

تو ہی بتا کہاں نہیں
تیرا وجودِ نازنیں
فرش سے تا بہ عرش ہے
تیری ادائے دل نشیں

سارے جہاں کے تاجور صلِ علیٰ محمد

گل میں ہے تیری رنگ و بو
تیری جلا ہے چار سُو
حق تو یہ ہے کہ حقۂ
کُن کی ہے وجۂ اصل تو
خلق کے شاہ و چارہ گر صلِّ علیٰ محمد

تیرا مکاں ہے لامکاں
پہلے سے تو ہی تھا وہاں
پہنچا وہاں تو بے دریغ
روح الامیں رُکے جہاں
تیرا مکاں تھا تیرا گھر صلِّ علیٰ محمد

تجھ پہ مسرتیں نثار
رحمت و برکتیں نثار
حشمت و جاہ کیا بھلا
اللہ کی رحمتیں نثار
تجھ پہ شہ و پیام بر صلِّ علیٰ محمد

سرورِ انبیا سلام
ہادی و رہنما سلام
میرا سلام کر قبول
آقائے مجتبیٰ سلام
تجھ پہ سلام چارہ گر صلِّ علیٰ محمد

بَر میں قبائے تار تار
دونوں جہاں کے تاجدار
سارے جہاں کے دادرَس
نظرِ کرم ہو ایک بار
فیضؔ کے خستہ حال پر صلِّ علیٰ محمد

سرمایۂ الہام

کلام: بابا فرید الدین شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ

منظوم اُردو ترجمہ: ارشد محمود ناشاد

(۱)

فریدا! جے تُوں عقل لطیف ، کالے لِکھ نہ لیکھ
آپنڑے گریوان میں ، سر نیواں کر دیکھ

☆

فرید اگر ہے تُو عاقل و دانا ، کالے کام نہ کر
جھانک گریباں میں اپنے اور سائیں کی ذات سے ڈر

(۲)

فریدا ! جاں تو کھٹّن ویل ، تاں تُوں رَتا دُنی سیوں
مرگ سوائی نینہہ ، جاں بھریا تاں لدیا

☆

فریدا! عمل کے لمحے تُو نے دُنیا سنگ گنوائے
سیر ہوا جب تُو دُنیا سے ، موت پریت بڑھائے

(۳)

فریدا گوکیندیاں ، چانگیندیاں ، متّیں دیندیاں نِت
جو شیطان وَنجایا ، سَے کِت پھیریں چِت

☆

فریدا! انھیں ہم روکیں ٹوکیں ،لاکھ انھیں سمجھائیں
جو شیطان کے بہکائے ہیں سیدھی راہ نہ پائیں

(۴)

فریدا! تھیو پواہی دَبھ ، جے سائیں لوڑیں سبھ
اِک چھجے ، بیا لتاڑیے ، تاں سائیں دے در واڑیے

☆

فریدا! اگر ہے من میں تیرے رب کی سچّی آس
عجز میں اتنا کامل ہو جا جوں رستے کی گھاس

(۵)

فریدا جاں لب تاں نینہہ ، کیا لب تاں کوڑا نینہہ
کِچر جھت لنگھاییے ، چھپر ٹُٹے مینہہ

☆

فریدا! ہوس ہے جس میں ذرا بھی ، جھوٹا ہے وہ پیار
ٹوٹا چھپر روک کے رکھے کب تک؟ مینہہ کی دھار

☆☆☆

منقبت حضرت مولانا فخر جہاں دہلویؒ

حافظ محمد بخش سیالوی

مہکتا گلستاں فخرِ جہاں ہیں
بہارِ بے خزاں فخرِ جہاں ہیں

تصوف علم و حکمت آگہی کی
متاعِ بے کراں فخرِ جہاں ہیں

دکن سے پاک پتن تک سفر کی
انوکھی داستاں فخرِ جہاں ہیں

ترے فیضِ رساں نورِ محمد
چراغِ چشتیاں فخرِ جہاں ہیں

خوشا وہ آپ کے مطلوب و مقصود
سلیمانِ زماں فخرِ جہاں ہیں

ترے شمس و قمر، مہرِ علی بھی
ضیا بخشِ جہاں فخرِ جہاں ہیں

درخشندہ یہ چشتی آستانے
زہے عظمت نشاں فخرِ جہاں ہیں

تری سوچوں کی مظہر پاک دھرتی
تری سوچیں جواں فخرِ جہاں ہیں

پریشان و شکستہ دل کے حافظ
سُرورِ قلب و جاں فخرِ جہاں ہیں

☆☆☆☆☆☆☆

منقبت حضرت قبلۂ عالم خواجہ نور محمد مہارویؒ

حافظ محمد بخش سیالوی

محبت کی زُباں ہیں قبلۂ عالم اخوت کا جہاں ہیں قبلۂ عالم

خدا کے نور کے تابندہ مظہر خودی کے راز داں ہیں قبلۂ عالم

جہالت کفر کے ظلمت کدوں میں ہدایت کی اذاں ہیں قبلۂ عالم

نُمایاں معرفت کے آسماں پر مثالِ کہکشاں ہیں قبلۂ عالم

شُعاعِ نور کے عکس منور درخشاں ضوفشاں ہیں قبلۂ عالم

وہیں صحراؤں میں گُلشن کھلے ہیں ذرا ٹھہرے جہاں ہیں قبلۂ عالم

ہوا حافظؔ اندھیروں میں اُجالا چراغِ چشتیاں ہیں قبلۂ عالم

☆☆☆☆☆

قسط نمبر ۱

خلفاءِ راشدین کے باہمی تعلقات اور محبتیں

علامہ قاری سعید احمد☆

الحمد اللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید نا الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین محمد وعلیٰ اھلِ بیتہ الطیبین الطاھرین وخلفائہ الراشدین واصحابہ المھدیین وعلیٰ من تبعھم الیٰ یوم الدین برحمتک یاارحم الراحمین ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا (قیامت کے دن) میرے حوض کے چاروں طرف سبیلیں لگی ہوں گی۔ان میں سے ایک پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ منتظم ہوں گے۔دوسری پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، تیسری پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور چوتھی سبیل پر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ منتظم ہوں گے جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے محبت کرتا ہو لیکن عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا ہواُسے حضرت عمر فاروق پانی نہیں پلائیں گے اور جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتا ہو لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا ہو اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ پانی نہیں پلائیں گے۔ جو شخص ان چاروں صحابہ کے متعلق اچھا عقیدہ رکھے وہ مؤمن ہے اور جو ان کے متعلق بُرا عقیدہ رکھے وہ منافق ہے۔

معلوم ہوا کہ خلفائے راشدین میں سے جو کسی ایک کا بھی دشمن ہوگا وہ روزِ قیامت جناب سرورِ کائنات ﷺ کے حوض کوثر سے پانی نہیں پی سکے گا اور وہ بغضِ صحابہ کی وجہ سے اللہ کے فضل اور حضور ﷺ کی رحمت سے محروم رہے گا۔نعوذ باللہ من ذالک۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اکثر حضرت

☆ مدرس جامعہ زینت الاسلام، ترگ شریف، تحصیل عیسیٰ خیل، ضلع میانوالی

علی رضی اللہ عنہ کے چہرے کو دیکھا کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا اے ابا جان آپ اکثر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چہرے کو کیوں دیکھتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیٹی میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: علی رضی اللہ عنہ کے چہرہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔

حضرت قیس بن ابی جازم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ملاقات ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ آپ مجھے دیکھ کر کیوں مسکرائے! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ تمہارے اجازت نامہ کے بغیر کوئی شخص پل صراط سے نہ گزر سکے گا۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ مسکرائے اور فرمایا: اے ابوبکر میں تجھے خوش خبری سناتا ہوں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا: کہ صرف اسی شخص کو اجازت نامہ دوں جو تمہیں محبوب رکھتا ہو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اور صحابہ کرام آپ کے گرداگرد جمع تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سامنے سے آئے۔ سلام کیا اور نبی کریم ﷺ کے قریب کھڑے ہو کے صحابہ کے چہروں کو دیکھنے لگے کہ کون ان کو جگہ دیتا ہے؛ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ داہنی جانب بیٹھے تھے آپ نے تھوڑا سا سرک کر فرمایا: ابوالحسن اس جگہ بیٹھ جاؤ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے درمیان بیٹھ گئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اُس وقت رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور پر خوشی کے آثار ظاہر ہوئے اور ارشاد فرمایا: اے ابوبکر کمال والے کی فضیلت کو کمال والا ہی جانتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی تصدیق:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدائے پاک کی قسم رسول اللہ ﷺ کی نہ اچانک وفات ہوئی اور نہ آپ ﷺ مقتول ہوئے بلکہ آپ ﷺ چند شب و روز بیمار رہے۔ مؤذن روزانہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور نماز کی اطلاع کرتا تھا اور آپ اس کو حکم فرماتے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور اُن سے کہو کہ نماز پڑھائیں۔ آپ ﷺ نے مجھ سے نماز نہیں پڑھوائی حالانکہ میں وہاں

موجود ہوتا تھا۔ اور آپ ﷺ کو میری موجودگی کا علم بھی ہوتا تھا۔ اگر رسول اللہ ﷺ کا میرے متعلق کوئی عہد ہوتا تو کسی کی یہ مجال نہ ہوتی کہ منبرِ نبوی پہ کھڑا ہو کر خطبہ پڑھ سکے۔ میں بزورِ شمشیر اس سے جہاد کرتا اور اپنا حق حاصل کرتا۔ پھر فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد ہم نے اپنے معاملے میں غور کیا تو ہماری سمجھ میں یہ آیا کہ نماز اسلام کا ستون اور دین کی اصل بنیاد ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے جس کو ہمارے دین کی امامت کا حکم فرمایا تھا اسی کو ہم نے اپنی دنیوی قیادت کے لیے منتخب کر لیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا کو اپنا امیر بنا لیا۔ جب انھوں نے جہاد کا اعلان کیا؛ ہم نے ان کے حکم پر جہاد کیا اور جو انھوں نے عطا کیا ہم نے اس کو بخوشی قبول کر لیا اور ان کے حکم سے حدود اللہ قائم کیں۔ کبھی کوئی اختلاف نہ ہوا اور باہم ہمیشہ متحد اور متفق رہے۔ مختصر یہ کہ اب کوئی ہمارے متعلق کسی قسم کی برائی اور گمراہی کو نہ پھیلائے۔

مشہور تابعی حضرت سعید بن میتب فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافتِ صدیق رضی اللہ عنہ کی تائید میں ایسی مستحکم دلیل بیان کی؛ جو کسی کے بھی ذہن میں نہ تھی۔ ان کا استدلال اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نماز کی امامت کے لیے مامور فرمایا تو معلوم ہوا کہ وہ دیگر تمام صحابہ سے افضل ہیں اور افضل کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو امیر بنانا درست نہیں۔ لہٰذا ابوبکر کی موجودگی میں کسی کی امارت جائز نہیں ہو سکتی۔ [**الموافقة بين اهل البيت والصحابه**، ص ۲۱]

اسماء بن حاکم فزاری سے مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث سنتا تو حق تعالیٰ مجھے اس سے نفع پہنچاتا اور جب کوئی دوسرا شخص مجھ سے حدیث رسول بیان کرتا تو میں اول اس سے قسم لیتا جب وہ قسم کھا لیتا تب میں اس کو سچ سمجھتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سچے تھے۔ لہٰذا ان سے قسم لینے کی ضرورت نہ تھی۔ [**الموافقة بين اهل البيت والصحابه**]

حضرت علی فرماتے ہیں کہ میں ایک روز رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ حضرت

ابوبکر اور حضرت عمر سامنے سے آتے نظر آئے اس وقت رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: علی یہ دونوں انبیا و مرسلین کے تمام اگلے پچھلے ادھیڑ عمر اہلِ جنت کے سردار ہیں لیکن علی تم ان کو اس کی اطلاع نہ کرنا۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ حضرت علی پر سہارا دیے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے۔ راستہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر سے ملاقات ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "علی ان سے محبت رکھنے والا جنت میں جائے گا۔

ایک مرتبہ رسول اللہ مہم پر کسی کو بھیجنا چاہتے تھے۔ اس وقت آپ کے دائیں اور بائیں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت علی نے عرض کیا ان میں سے ایک کو بھیج دیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں ان کو کس طرح بھیج سکتا ہوں۔ یہ دونوں تو دین کے لیے بمنزلہ کان اور آنکھ کے ہیں۔ یعنی ان دونوں حضرات کا وجود دین کے لیے خاص اہمیت اور شان رکھتا ہے جس کے فقدان سے دین میں نمایاں کمی اور خرابی محسوس ہوگی۔

[جاری ہے]

☆☆☆☆☆☆☆

تذکرۂ اولیائے چشت

[حضرت خواجہ ابو علی ممشاد علو دینوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ]

مولوی محمد رمضان معینی تونسوی

سلسلہ عالیہ نظامیہ چشتیہ کے عظیم المرتبت شیخِ طریقت حضرت خواجہ ابو علی ممشاد علو دینوری کے بارے میں ''سِرُ العارفین'' یعنی حالاتِ مشائخ چشتیہ کے مؤلف بہاؤ الدین محمود ناگوری لکھتے ہیں کہ: السرفی ذکر شیخ المشائخ شیخ علو دینوریؒ شیخ علی رعلو دینوری رحمۃ اللہ علیہ نامدار شیخ اور صاحب اسرار عارف تھے اور بڑے اعلیٰ درجہ کے عالم تھے۔ شیخ معروف کرخی علیہ الرحمہ (م۔۲۰۰ھ) آپ کی صحبتِ پاک میں اکثر رہا کرتے تھے اور آپ نے بہت سے درویشوں کو دیکھا تھا اور مشائخ کی خدمت کی تھی۔ جس شیخ کے پاس آپ جاتے وہی کوئی نعمت عطا کرتا (سر العارفین، ص ۷۰، ۷۱) راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق آپ کی کنیت ابو علی ہے۔ [عوارف المعارف باب ۲۲] نام مبارک ممشاد ہے اور دو القاب آپ کے ہیں علو، کریم الدین، ''مناقب المحبوبین''، ''اقتباس الانوار'' میں لکھا ہے کہ: آپ کا اسمِ مبارک علو لقب کریم الدین اور ممشاد علو دینوی کے نام سے مشہور ہیں۔

''اقتباس الانوار'' میں لکھا ہے کہ: اسم شریفش خواجہ علو است و لقب شرف وے کریم الدین و خرقہ فقر و ارادت از دست خواجہ ہبیرۃ البصری قدس سرہ پوشیدہ ایں کاتب الحروف از اکثر کتبِ تواریخ کہ در احوالِ مشائخ نوشتہ اند؛ چناں معلوم نمودہ کہ علو دینوری ہماں ممشاد دینوری است قدس سرہ و از پیرانِ خود نیز ہم چنین سماع دارد لیکن صاحب مراۃ الاسرار علو دینوری وجدا پیر حضرت خواجہ ابو اسحاق شامی نوشتہ و ممشاد دینوری بزرگے دیگر علیحدہ نوشتہ و ایں فقیر بنا بر سند مشائخ خود روایت مراۃ الاسرار در چیز اعتبار جائے ندارد، یک بزرگ کہ عبارت از علو ممشاد دینوری باشد

☆ خانقاہِ معلیٰ حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسویؒ، تونسہ مقدسہ [ڈیرہ غازی خان]

نوشتہ واللہ اعلم (اقتباس الانوار [فارسی] ،ص ۱۰۴-۱۰۵)

اختلاف ہے کہ سلسلہ چشتیہ کے تذکرہ نویسوں کے مطابق خواجہ ممشاد علو دینوری ایک ہی شخصیت کا نام ہے، جنھوں نے سلسلہ کا فیض حضرت خواجہ ہبیرہ بصری سے حاصل کیا۔ علاوہ ازیں حضرت جنید بغدادیؒ سے بھی خلافت حاصل کی لیکن مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ، شہزادہ دارا شکوہ قادری، عبدالرحمٰن چشتی صابری مؤلف ''مرات الاسرار'' کے خیال میں حضرت خواجہ ممشاد علو دینوی اور حضرت خواجہ ممشاد دینوری دوسرے بزرگ ہیں۔ اس بحث میں پروفیسر لطیف اللہ صاحب نے اپنے نقطۂ نظر ''مطلوب الطالبین'' کے حاشیہ میں پیش کیا۔ مولد دینور جو ہمدان سے ۲۴ فرسنگ دور ہے۔ بغداد میں پرورش ہوئی۔ آپ نے سالہا سال ریاضت و مجاہدہ میں گزارے اور پھر حضرت خواجہ ہبیرہ بصری کی خدمتِ اقدس میں پہنچ کر ان کے مرید ہوئے۔ کچھ عرصہ ریاضت اور مجاہدہ اپنے شیخ کی زیرِ نگرانی کیا۔ اس کے بعد حضرت ہبیرہ بصری نے آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا آپ ہمیشہ تلاوتِ کلام مجید میں مشغول رہتے۔ مشائخ چشتیہ کے نزدیک ایک ہی شخصیت ہے۔ چنانچہ حضرت خواجہ غلام فرید کوٹ مٹھنی فرماتے ہیں کہ: فرمایا شیخ ممشاد علو دینوری قدس سرہ کے متعلق کتب تواریخ مثل ''نفحات الانس''، ''سفینۃ الاولیاء''، ''مراۃ الاسرار''، ''سیر الاولیاء'' اور تکملہ مولوی گل محمد احمد پوری وغیرہ میں اختلاف ہے۔ بعض لکھتے ہیں کہ ممشاد دینوری شیخ جنید کے خلیفہ ہیں اور شیخ احمد سود دینوری جو سلسلہ سہروردیہ کے اکابر مشائخ میں سے ہیں، انہی شیخ ممشاد دینوری کے مرید ہیں اور شیخ علو دینوری جو سلسلہ چشتیہ میں حضرت ابواسحاق شامی چشتی کے پیر ہیں شیخ ہبیرہ بصری کے مرید و خلیفہ ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ سیرت کی تمام کتابوں میں سلسلہ جنیدیہ سہروردیہ کے ساتھ آپ کا اسمِ گرامی شیخ ممشاد دینوری لکھا گیا ہے اور سلسلہ چشتیہ میں شیخ علو دینوری درج ہے چنانچہ نفحات الانس شریف میں حضرت ابواسحاق شامی کے ذکر میں لکھا ہے کہ آپ حضرت شیخ علو دینوری کے اصحاب میں سے ہیں۔ سلطان المشائخ حضرت محبوبِ الٰہی جب اپنے خلفاء کو خلافت نامہ دیتے تھے تو حضرت ابواسحاق کے خرقہ خلافت کے متعلق یہی لکھتے تھے کہ انھوں نے شیخ علو

دینوری سے خرقۂ خلافت حاصل کیا اور انھوں نے حضرت شیخ ہبیرہ بصری سے۔اس کے بعد فرمایا:
میں کہتا ہوں کہ ممشاد دینوری دونوں نام ایک ہی شیخ کے ہیں اس وجہ سے ہے کہ تذکرہ نویسوں نے
حضرت شیخ ممشاد دینوری کے جو اوصاف و حالات لکھے ہیں وہ بعینہ وہی ہیں جو شیخ ممشاد دینوری
کے ہیں چنانچہ شیخ ممشاد دینوری کے حالات میں لکھا ہے کہ مہد سے لے کر لحد تک (پیدائش سے قبر
تک) تمام عمر صائم الدہر تھے یہاں تک کہ ایام شیر خوارگی میں دن کے وقت والدہ کا دودھ نہیں
پیتے تھے اور یہی بات بعینہ شیخ علو دینوری کے تذکروں میں پائی جاتی ہے۔ نیز جو ممشاد دینوری کی
تاریخِ وفات ہے وہی شیخ علو دینوری کی ہے اسی طرح دونوں بزرگوں کے تمام حالاتِ زندگی
یکساں ہیں چونکہ آپ کو دو بزرگوں سے خلافت حاصل تھی ایک حضرت شیخ جنید بغدادی سے؛ دوم
شیخ ہبیرہ بصری سے، اس لیے دونوں سلسلوں میں آپ کا اسمِ گرامی درج ہے۔ ایک نسبت جنیدیہ
سہروردیہ سے اور ایک نسبت چشتیہ بہشتیہ سے؛ اس طرح ایک بزرگ کی متعدد مشائخ سے خلافت
حاصل کرنے کی مثالیں تاریخ میں بہت ہیں (مقابیس المجالس، مترجم کپتان واحد بخش سیال، ص
۱۰۶۴۔۱۰۶۵، اشاعت رجب المرجب ۱۴۱۱ھ)

وطن: "خواجہ علو ممشاد دینوری قدس سرہ اصل وے از دینور بکسرِ اول وسکون یاء و فتح نون نام
شہریست از شہر ہائے کوہستان در بغداد نشو و نما یافتہ" مولوی محمد گھلو مرید مولانا نور محمد نارووالہ
صاحب نے حضرت قبلۂ عالم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "دینور" بکسر دال وسکون یا
و فتح نون ہمدان اور بغداد کے درمیان ایک شہر کا نام ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ جواہر مودودی میں
تحریر ہے قطبِ ابدال حضرت خواجہ علو دینوری بکسر عین مہملہ وسکون لام و دینور بکسر دال مہملہ وسکوں
ثناۃ تحتیہ و فتح نون و واؤ را مہملہ شہری است از شہر ہائی کوہستانی کہ میانِ ہمدان و بغداد اوست یک
قرمین کہ معرب کرمان شاہ است کذانی حاشیہ عبدالغفوری ، (جواہرِ مودودی قلمی عکسی، ص ۱۴۵)، شجرۃ
الانوار میں لکھا ہے کہ: حضرت خواجہ ممشاد علو دینوری بکسر الدال وسکون الیا و بفتح نون شہریست از شہر
ہائے کوہستان کہ درمیان کوہ ہمدان و بغداد است ، (شجرۃ الانوار فخری، نسخہ تونسوی، ص ۹۲) دارا شکوہ

قادری تحریر کرتے ہیں حضرت ممشاد دینوری، دینور شہریست از شہر ہائے جنبل نزدیک قرمین، (سفینۃ الاولیاء، فارسی ص ۱۱۰) خواجہ ممشاد الدینوری قدس سرہ از طبقہ ثانیہ است اول وی از دینور بود و دینور شہریست از شہر ہائے کوہستان مغرب کرمان شاہ و در بغداد نشو و نما یافت (مراۃ الاسرار قلمی عکسی ورق ۱۱۵)

پیرو مرشد: آپ کے پیر و مرشد حضرت خواجہ ہبیرہ بصری ہیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ آپ نے حضرت یحییٰ جلا سے بھی فیض پایا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت جنید بغدادی سے بھی فیض یاب ہوئے ہیں۔ صاحب سیر الاقطاب تحریر کرتے ہیں کہ: حضرت کریم الدین شیخ ممشاد علو دینوری لقب او کریم الدین است و خرقہ فقر و ارادت از تاج العارفین حضرت شیخ ہبیرہ بصری یافتہ قدس اللہ سرہ و بہ صحبت شیخ معروف کرخی قدس اللہ سرہ العزیز اکثر بودہ و ازاں بزرگ وار نامدار نیز خلافت دارد و صاحب سلسلہ است؛ چنانچہ بہ چہار واسطہ بہ اُو میرسد۔ بدیں طریق شیخ المشائخ ممشاد علو دینوری خلافت از حضرت شیخ عبداللہ خفیف دارد و ہومن شیخ محمد رویم و ہومن سید الطائفہ حضرت خواجہ جنید بغدادی و ہومن حضرت شیخ سری سقطی و ہومن حضرت شیخ معروف کرخی (ص ۵۰)۔

سیر الاقطاب کی اس عبارت میں بھی ابہام ہیں حضرت ابی عبدالرحمٰن محمد بن الحسین السلمی (م۔ ۴۱۲ھ) تحریر کرتے ہیں کہ: حضرت ممشاد دینوریؒ صوفیہ کے اکابر مشائخ میں شمار ہوتے تھے، یحییٰ جلاء اور ان سے اوپر کے مشائخ کی صحبت میں رہے۔ علمِ تصوف میں بہت بلند مقام پر فائز تھے، ایک جوان مرد صوفی تھے۔ بڑے صاحبِ دل اور فتوت کا درجہ رکھتے تھے (طبقات الصوفیہ، ص ۲۲۲م، مترجم شاہ محمد چشتی، ۲۰۱۱ء) مولانا ابی الفرج عبد الرحمٰن بن الجوزی (پ۔ ۵۱۰ھ۔ م۔ ۵۹۷ھ) لکھتے ہیں۔ حضرت ممشاد دینوریؒ۔ ابوبکر رازی کے مطابق حضرت ممشاد دینوری فرماتے ہیں کہ خدا کا راستہ بہت لمبا ہے اور اس کے ساتھ صبر کرنا ایک مشکل کام ہے پھر فرمایا: سب سے بری غفلت اس شخص کی پیروی نہ کرنا ہے جو تیری نیکی سے غافل نہیں ہوتا اور اس کی یاد بھلانا ہے جو تیرے ذکر سے غافل نہیں ہوتا؛ پھر فرمایا: نیک لوگوں کے ساتھ مل بیٹھنے سے

دل میں درستگی پیدا ہوتی ہے اور فسادیوں کے ساتھ مل بیٹھنے سے دل میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔
حضرت ممشاد دینوریؒ حضرت یحییٰ جلا جیسے مشائخ کی صحبت میں رہے (صفۃ الصفوۃ، جلد دوم، ص۔۳۱۱) مولانا عبدالرحمٰن جامی لکھتے ہیں کہ: ممشاد علو دینوریؒ: آپ تیسرے طبقہ میں ہیں اور عراق کے بڑے مشائخ اور ان کے جوان مردوں میں ہیں؛ علم میں یکتا تھے۔ آپ کی کرامات ظاہر تھیں اور حالات عمدہ، اور یحییٰ جلا اور مشائخ کی صحبت میں رہے ہیں۔ حضرت جنید اور رویم و نوری کے ہم زمانہ ہیں؛ کہتے ہیں کہ ۲۹۹ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (نفحات الانس جامی، ص ۱۰۴، ۱۰۵ مترجم: سید احمد علی شاہ چشتی نظامی، ناشر اللہ والے کی قومی دکان)
ذوقِ سماع: خواجہ علی دینوری شیفتۂ عشق و سماع تھے۔ اپنے مشائخ کے عرس خود کرتے تھے اور عرس کے دن سماع سنتے تھے کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ سماع سننا اور وہ بھی عرس کے دن کہاں سے آیا ہے؟ (یعنی کیسے جائز ہے) آپ نے فرمایا: ہمارے پیغمبر محمد مصطفیٰ ﷺ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ہمارے تمام مشائخ نے سماع سنا ہے۔ لیکن عرس کے دن خصوصیت یہ ہے کہ ان کو (یعنی جن کا عرس کیا جاتا ہے) اس روز وصالِ دوست میسر ہوا ہے۔ **الموت یوصل الحبیب الی الحبیب.** (موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملاتی ہے) پس مَیں اپنے پیروں کے وصال کی شادی کے دن سماع سنتا ہوں تاکہ ان کی توجہ سے ہم بھی مقام وصال کو پہنچیں۔ (مراۃ الاسرار مترجم، ص ۳۴۱۔۳۴۲)
حضرت شیخ ابو نصر سراجؒ (م۔۳۷۸ھ) ''کتاب اللمع فی التصوف'' میں لکھتے ہیں کہ:
احمد بن علی الکرجی المعروف بہ الوجیہی کہتے ہیں: صوفیہ کی ایک جماعت حسن قزازؒ کے گھر میں موجود تھی اور قوال بھی تھے جو گاتے جاتے تھے اور وہ سب وجد کرتے جاتے تھے کہ اتنے میں ممشادؒ وہاں آ نکلے جب اِن کی نظر اُن پر پڑی، تو سب خاموش ہوگئے۔ ممشادؒ نے کہا: کیا بات! تم سب خاموش کیوں ہوگئے ہو۔ اُسی حالت پر لوٹ جاؤ۔ اگر دنیا کے تمام ساز بھی چھیڑ دیئے جائیں تو یہ میرے دِل کو میرے رب سے غافل نہیں کر سکتے۔

ممشادؒ کی جو کیفیت بیان ہوئی ہے وہ بھی کچھ عجیب نہیں۔ کیونکہ اہلِ کمال کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ کسی خارجی واردات کے لیے ان کے اندر کوئی توجہ موجود ہی نہیں ہوتی اور ان کے طبائع اور بشریت میں اگر کوئی حاسہ باقی بھی ہوتا ہے تو بدلا ہوا اور نہایت آراستہ کہ نغمات و ترنم سے یا خوش الحانیوں سے کوئی لذت حاصل نہیں کرتا کیونکہ ایسے لوگوں کے غم جدا اور ان کے باطن پاک ہوتے ہیں ان پر لوگوں سے ملنا، ظلماتِ نفس اور حواس کی کدورتیں اثر انداز ہی نہیں ہو سکتیں اور یہ مقام اللہ ہی چاہے جس کو عطا کرے (کتابُ اللمع فی التصوف، ص۴۸۶۔۴۸۷، مترجم سید اسرار بخاری، مطبوعہ تصوف فاونڈیشن لاہور، سال اشاعت ۱۴۲۰ھ/۲۰۰۰ء)

حضرت شیخ ضیا الدین ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی (پ۔۴۹۰ھ۔م۔۵۶۳ھ) اپنی تالیف آداب المریدین میں آدابِ سماع کے باب میں تحریر کرتے ہیں کہ: اگر مجلس سماع کا اتفاق ہو تو ابتدأ قرآن سے کرنی چاہیے اور اسی پر ختم کرنی چاہیے۔ حضرت ممشاد دینوری سے حکایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور سوال کیا: جب صوفیہ سماع کے لیے جمع ہوں تو کیا قرآن سے ابتدا اور اس پر اختتام کیا جائے یا نہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (آداب المریدین مترجم، ص ۱۰۷)

حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی (پ۔ ۵۳۹ھ۔م۔محرم ۶۳۲ھ) عوارف المعارف کے باب ۲۲ میں تحریر کرتے ہیں۔ ممشاد دینوری سے منقول ہے کہ کہا مَیں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا تو مَیں نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ اس سماع سے کچھ انکار کرتے ہیں؟ فرمایا کہ مَیں اس سے انکار نہیں کرتا مگر اُن سے کہہ دے کہ اس سے پہلے قرآن پڑھیں اور اُس کے بعد قرآن پڑھیں۔ سو مَیں نے کہا؛ یا رسول اللہ ﷺ وہ لوگ مجھے ایذا دیتے اور خوش ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اُن سے تحمل کر، یا ابا علی کہ وہ تیرے اصحاب ہیں۔ پس ممشاد فخر کرتے اور کہتے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے کنیت بخشی۔ مگر وجہ انکار کی اُس میں یہ ہے کہ ایک مریدوں کی جماعت مبادی ارادت میں در آئے اور صد مجاہدہ پر ان کے نفوس مشتاق نہیں

ہوئے تاکہ صفاتِ نفس کے ظہور اور احوالِ قلب کا علم اُن کو پیدا ہوا اور اُن کی حرکات کو قانونِ علم سے منضبط کریں اور وہ جان لیں کہ اُن کے فائدہ کی باتیں کیا ہیں؟ اور ان کے نقصان کی باتیں کیا ہیں۔ (عوارف المعارف، ص ۲۱۱ ،مترجم مولوی ابو الحسن مرحوم، ناشر ادارہ اسلامیات ،لاہور، طباعت صفر المظفر ۱۴۱۵ھ/جولائی ۱۹۹۴ء)

راقم الحروف نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ امام مقدسی [آپ شام کے جلیل القدر اور قدیم مشائخ میں سے تھے آپ نے حضرت ذوالنون مصریؒ کو دیکھا تھا اور حضرت یحییٰ جلا کی صحبت میں رہے؛ آپ صاحبِ علم تھے]۔ یہ وہ شخص ہیں جنھیں حضرت شبلیؒ اہل حبر الشام یعنی اہلِ شام کے زبردست عالم کہتے تھے۔[بحوالہ طبقات الصوفیہ، ابی عبدالرحمٰن محمد بن الحسین السلمی ،۴۱۲ھ] نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ ممشاد دینوری نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ اور حضور کریم علیہ الصلوۃ والسلام سے سماع کے متعلق دریافت کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ **لا انکر منہ ولکن قل لھم یفتحون قبلہ بالقران و یختتمون بعد بالقران.** یعنی سماع میں کچھ منکر نہیں پاتا۔ تم ان سے کہو کہ سماع کی ابتدا اور اختتام قرآن مجید سے کریں۔

حالتِ بیماری: جب حضرت ممشاد بیمار ہوئے تو ان سے پوچھا گیا: آپ کی بیماری کا کیا حال ہے؟ انھوں نے کہا: بیماری سے پوچھو کہ وہ کس طرح مجھ کو پاتی ہے، ان سے کہا گیا کہ آپ کے قلب کی کیا کیفیت ہے؟ انھوں نے کہا: تیس برس ہوئے کہ میں نے اپنے دل کو کھو دیا ہے۔ (آداب المریدین، ص ۱۲۱)

غربا سے پیار: حکایت ہے کہ حضرت ممشاد دینوری کے پاس جب غریب لوگ آتے تو وہ بازار میں جاتے اور دوکانوں سے جو کچھ ملتا جمع کر کے لاتے اور ان کو دے دیتے اور اس چیز کو وہ سوال نہیں سمجھتے تھے کیونکہ یہ نیکی اور پرہیزگاری میں مدد دینا ہے (آداب المریدین، ص ۱۱۸، یہ قرآنِ مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے کہ **وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا**

علی الاثم و العدوان ،نیکی اور پرہیز گاری میں مدد کرو اور گناہ اور ظلم میں مدد نہ کرو۔)

وصال: نقل ست کہ آں حضرت چہاردہم ماہ محرام الحرام در سنہ تسع وتسعین و مائتین برحمت حق پیوست چنانچہ تاریخ وصال آں حضرت ایں دعا گو قدوہ اولیاے حق بودہ یافتہ است، (سیر الاقطاب فارسی، ص ۵۵) وفاتش در سنہ تسع وتسعین و مائتین واقع شد، (مراۃ الاسرار قلمی عکسی، ورق ۱۱۵) عبد الرحمٰن چشتی صابری لکھتے ہیں کہ: آپ کا وصال چودہ محرم کو ہوا لیکن سنِ وفات معلوم نہیں ہو سکا۔ آپ طبقۂ ثانیہ سے تعلق رکھتے ہیں (مراۃ الاسرار، مترجم ص ۳۴۱۔۳۴۲) وفات آں حضرت بتاریخ چہاردہم ماہِ محرم الحرام سنہ تسع وتسعین و مائتین واقع شد و تاریخ وصالش صاحب سیر الاقطاب قدوۂ اولیائے حق بودہ گفتہ است۔ (اقتباس الانوار فارسی، ص ۱۰۶) آپ کا وصال ۱۴ محرم الحرام ۲۹۹ھ میں ہوا جیسا کہ ''اقتباس الانوار'' اور آداب الطالبین میں لکھا ہے؛ البتہ ''شجرۃ الانوار'' میں لکھا ہے کہ آپ نے ۴ محرم کو وصال فرمایا ''سیر الاقطاب'' میں آپ کی تاریخِ وصال ''قدوۂ اولیائے حق بودہ'' لکھی ہے۔آپ کی مرقد انور کس جگہ ہے تحقیق نہیں ہو سکی۔

اہل وعیال: سر العارفین کے مولف بہاؤ الدین محمود ناگوری تحریر کرتے ہیں کہ: منقول ہے کہ ایک روز شیخ علو دینوری رحمۃ اللہ علیہ نے تارک الدنیا ہو کر دس ہزار درہم فقیروں کو دیے اور آپ کے پاس دنیاوی اسباب بے شمار تھا۔ سب لوگوں کو دے دیا اور کھانے کے لیے کچھ نہ رکھا؛ جب کھانے کا وقت آیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی اور رو بہ قبلہ ہو کر عرض کی۔ اے پروردگار! تیرے سوا ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ اب افطار کا وقت آ گیا ہے۔ مَیں اہل وعیال کو تیرے سپرد کرتا ہوں۔ تو انھیں روزی دے۔ آواز آئی کہ اے علو دینوری تو ہمارے ساتھ رہو۔ تیرے اہل وعیال کا مَیں ذمہ دار ہوں۔ آپ رُو بہ قبلہ بیٹھے تھے کہ اتنے میں آپ کے بیٹے نے آ کر آپ کے مبارک کندھے کو پکڑ کر کہا اے [ایک] عزیز دستر خوان طعام کا لایا ہے۔ اور دروازے پر کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ مَیں یہ علو دینوری کے فرزندوں کے لیے لایا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ جا اسے بُلا لا۔ لڑکا بُلا لایا۔ اس نے خوانچہ آپ کے سامنے رکھا اور کہا: حکم ہوا ہے کہ اے علو!

تیرے بال بچے سب میرے بندے ہیں۔تو ان کا غم نہ کر،مَیں اپنے خزانے سے انھیں رزق دوں گا۔تو میرے کام میں کوتاہی نہ کرنا(سرّ العارفین مترجم،ص ۷۱)

خلفا: آپ کے تین خلیفہ تھے(1)خواجہ ابواسحاق شامیؒ۔مولانا جامیؒ آپ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ:آپ (شیخ ابواسحاق شامی قدس سرہ) بڑے بزرگ ہوئے ہیں۔آپ کی قبر عکہ میں ہے جو کہ بلادِشام میں ہے۔شیخ علو دینوری کے مرید ہیں اور وہ شیخ ہبیرہ بصری کے مرید تھے وہ حذیفہ مرعشی کے؛ وہ حضرت ابراھیم ادھم قدس اللہ اسرارہم کے مرید تھے۔ یہ شیخ ابواسحاق شامی چشت میں پہنچے ہیں اور خواجہ ابواحمد ابدال نے کہ چشت کے اعلیٰ درجہ کے مشائخ ہیں۔ان کی صحبت حاصل کی اور انھیں سے تربیت حاصل کی۔ (نفحات الانس، سالِ تالیف ۸۸۳ھ، ص ۳۵۴)(2)ابوعامر(3)شیخ احمد اسود۔[۵]

منقولست کہ آں حضرت سہ خلیفہ داشت خواجہ ابواسحاق چشتی وابوعامر وشیخ احمد اسود دینوری کہ او در سہروردیاں صاحب سلسلہ است (،اقتباس الانوار فارسی،ص ۱۰۶)سہ کس را آں حضرت اجازت وتربیت وارشاد دادہ اند وآوردند یکے ازاں خواجہ ابواسحاق دویم ابوعامر سیوم شیخ احمد اسود کہ در سہروردیان صاحب سلسلہ است وروزِ وفات آں حضرت بیست وچہارم محرم است،(شجرۃ الانوار نسخہ تونسوی،ص ۹۳)نقل ست کہ آں حضرت سہ خلیفہ داشت حضرت خواجہ ابواسحاق شامی وشیخ ابوعامر وشیخ احمد اسود دینوری کہ او در سہروردیاں صاحب سلسلہ است رحمت اللہ علیہم ۔(سیر الاقطاب فارسی،ص ۵۵)

حاجی نجم الدین سلیمانی لکھتے ہیں کہ:ذکر حضرت خواجہ ممشاد علو دینوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

بدانکہ نام ایشاں علو ولقب کریم الدین ست ومشہور اند بہ ممشاد علو دینوری،مولد ایشاں دینور ست ونشو ونما در بغداد یافتہ اند،ودر سفینۃ الاولیاء نوشتہ کہ دینور بفتح دال وسکون یا وضم نون شھر یست از شھر ہای جنبل نزد قرمین،ودر"مرات الاسرار" نوشتہ کہ دینور شھر یست از شھر ہای کوہستان مغرب،ودر"خیر الاذکار"مولوی محمد گھلوی مرید مولانا نور محمد نارووالہ صاحب از حضرت قبلہ عالم روایت نوشتہ کہ آں حضرت

میفر مودند کہ دینور بکسر دال وسکون یا دفتح نون شہر یست درمیان ہمدان وبغداد، واللہ اعلم بالصواب، وفات، ایشاں بتاریخ چہاردہم محرم درسنہ دوصد ونود ونہ ہجری شد کذافی ''اقتباس الانوار وآداب الطالبین''، امادر شجرۃ الانوار نوشتہ کہ [بست و] چہارم محرم شد ودر سیر الاقطاب تاریخ وصال ایشاں نوشتہ است قدوہ اولیائے حق بودہ،، قبر، ایشاں تحقیق نشد، وایشاں راسہ خلفاً بودند اول خواجہ ابواسحاق شامی دویم ابوعامر سیوم شیخ احمد اسود، و در سفینۃ الاولیاء نوشتہ و نیز در اکثر کتب آوردہ است کہ آنچہ در تذکرۃ الاصفیاء وبعضے شجرات مشائخ چشت نوشتہ است اینست کہ شیخ علود ینوری وشیخ ممشاد دینوری یک ست وایشاں راممشاد علود ینوری می نویسد، امادر نفحات الانس نوشتہ و نیز در بعضے کتب دیگر آوردہ کہ علود ینوری غیر ممشاد دینورست وممشاد دینوری صدر سلسلہ سہروردیہ اند مرید خواجہ جنید بغدادی واز قران خواجہ رویم وابوالحسن نوری اند۶۴

ملفوظات:

۱۔ ایک صوفی فرماتے ہیں کہ میں ممشاد دینوری کی وفات کے وقت ان کے پاس تھا۔ آپ سے کسی نے پوچھا آپ بیماری کو کیسا پاتے ہیں؟ پھر کسی نے کہا لا الہ الا اللہ کہیے اس پر آپ نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف کر دیا اور کہا میں نے اپنے آپ کو ہمہ تن تمہاری خاطر فنا کر دیا، کیا تم سے محبت رکھنے والوں کی یہی جزا ہے۔ (قشیریہ، ص۔۵۴۹)

۲۔ میں نے عبداللہ بن یوسف الاصبہانی سے سنا کہ ابوالحسین بن عبداللہ طرطوسی نے کہا کہ علوش الدینوری فرماتے تھے کہ میں نے مزین کبیر کو فرماتے سنا کہ وہ مکہ میں تھے کہ مجھے سخت بیقراری لاحق ہوتی تھی۔ (قشیریہ اردو، ص۔۵۵۳)

۳۔ کہتے ہیں کچھ لوگ ممشاد دینوری کے پاس ان کے مرض الموت میں آئے اور پوچھا: اللہ تعالٰی نے تم سے کیا سلوک فرمایا؟ فرمایا: تیس سال سے جنت مجھے پیش کی جاتی ہے مگر میں نے ایک لحظہ کے لیے بھی اس کی طرف نگاہ نہیں کی؛ اس کے بعد نزع کے وقت انھوں نے ان سے پوچھا آپ دل کو کیسا پاتے ہیں۔ فرمایا: میں تو تیس سال سے اپنا دل کھو چکا ہوں۔ (قشیریہ اُردو، ص۵۵۴)

۴۔ لطائفِ اشرفی حصہ اول ص ۱۱۳ پر تحریر ہے کہ حضرت ممشاد علو دینوری قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ عالمِ راز میں عارف کا دِل ایک آئینہ ہے جب تک وہ اس آئینہ میں دیکھتا ہے تو وہ اللہ کو دیکھتا ہے اس کے دل میں جگہ ایسی ہے کہ سوائے اللہ کے اور کوئی اس میں جگہ نہیں پاتا۔ (لطائفِ اشرفی حصہ اول لطیفہ ۳، ص ۱۱۳)

۵۔ حق کا راستہ بہت دور کا ہے اور حق کے ساتھ صبر بہت مشکل ہے۔

۶۔ اگر اولین و آخرین کی دانائی جمع کر لی جائے اور سردار قسم کے اولیا کے احوال اکٹھے کیے جائیں تو اس وقت تک یہ عارفین کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتے جب تک تمہارا باطن، اللہ کے ساتھ نہ ہو اور ہر معاملے میں تمہارا اُس پر بھروسہ نہ ہو۔

۷۔ حضرت فارس دینوری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ممشاد دینوریؒ گھر کے دروازے سے نکلے تو ایک کتا بھونکا۔ آپ نے اسی وقت پڑھا لا الہ الا اللہ، تو وہ کتا اسی مقام پر مر گیا۔

۸۔ اس ذات کی فرمان برداری سے غفلت کرنا کتنا برا ہے جو تم پر احسان اور نیکی کرنے سے غافل نہیں ہوتا اور اس ذات کے ذکر سے غفلت کتنی بری ہے جو تمہیں یاد رکھنے سے غافل نہیں ہے۔

۹۔ علیحدگی میں اس کا دل فارغ ہو جانا جس کا دامن تمام دنیا تھامے ہوئے ہے، ان کی دنیا کے فضول ہونے میں شمار ہوتا ہے۔

۱۰۔ ایک عارف کے پاس ایسا شیشہ ہوتا ہے کہ جب وہ اس میں دیکھتا ہے تو اس میں اسے اپنا مولیٰ نظر آتا ہے۔

۱۱۔ مَیں جب بھی اپنے مشائخ میں سے کسی کے پاس حاضر ہوتا تو اپنے ہاں کی ہر چیز سے خالی ہو کر حاضری دیتا اور دیکھتا کہ آپ کی زیارت اور کلام سے مجھے کیا کچھ ملتا ہے کیونکہ جو شخص اپنے آپ میں کچھ بن کر کسی شیخ کے پاس جاتا ہے تو وہ ان کی زیارت، ہم مجلسی، ادب اور کلام کی برکتوں سے کچھ نہیں لے سکتا۔

۱۲۔ مَیں نے کسی سفر کے دوران ایک شیخ کو دیکھا تو مجھے ان میں کچھ بھلائی کے آثار دکھائی دیے چنانچہ میں نے کہا: اے آقا! مجھے بھی کوئی ہدایت فرمایے۔ انھوں نے کہا ہمت کرتے رہیے کیونکہ سارے کام اس سے سرانجام پاتے ہیں اور جس کا ارادہ نیک ہو اور خلوص والا ہو تو سارے اعمال اور احوال درست ہوتے چلے جاتے ہیں۔

۱۳۔ ایک مرید کے لیے یہ چار آداب بجالانا نہایت ضروری ہے۔

☆ مشائخ کا احترام لازمی طور پر کرتا رہے۔

☆ مسلمان بھائیوں کی خدمت کیا کرے۔

☆ کسی بھی سبب پر بھروسہ نہ کرے۔

☆ اپنے آپ کو شریعت کے آداب پر چلتے رہنے کی کوشش کرے۔

۱۴۔ اسباب ایک رکاوٹ ہوتے ہیں۔ بلند مقام حاصل کرنے میں رکاوٹیں پیدا ہوا کرتی ہیں طے شدہ اللہ کے فیصلوں میں انشاء اللہ کہنا انسان کو ایک بوجھ سے فارغ کر دیتا ہے۔

۱۵۔ لوگوں میں سب سے بہتر حال والا وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے آپ کو لوگوں کی طرف توجہ کرنے سے بچائے۔ تنہائی میں اپنے راز سنبھالے رہے اور اپنے تمام کاموں میں اللہ پر بھروسہ رکھے۔

۱۶۔ نیک لوگوں کے پاس بیٹھنے سے دل درست ہو جاتا ہے جب کہ فسادیوں کے پاس بیٹھنے سے دل میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

۱۷۔ توکل یہ ہوتا ہے کہ جس شے کی طرف تمہارا دل اور نفس جھکاؤ کرے اس کا لالچ نہ رکھو۔

۱۸۔ مرید کے لیے مرشد کی خدمت اور بھائیوں کا ادب ضروری ہے اور تمام خواہشاتِ نفس سے کنارہ کش ہو کر اتباع سنت لازمی ہے۔

۱۹۔ میں نے اس وقت تک کسی بزرگ سے ملاقات نہیں کی جب تک اپنے تمام علوم و حالات کو ترک نہیں کر دیا اور جب ان چیزوں سے دست بردار ہو کر کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کے اقوال کو غور سے سننے کے بعد ان کی برکتوں سے فیوض حاصل کیے اسی کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے ان مراتب سے سرفراز فرمایا۔

۲۰۔ اگر کسی ادنیٰ قدر و خودی کے ساتھ ان بزرگوں سے ملتا ہے تو اس کے لیے بزرگوں کے اقوال و صحبت سب بے سود ہیں۔

۲۱۔ اہلِ خیر کی صحبت سے قلب میں صلح و خیر پیدا ہوتی ہے اور اہلِ شر کی صحبت قلب کو فتنہ و فساد کی جانب مائل کر دیتی ہے۔

۲۲۔ علائق کے تین اسباب ہیں۔

اول: ان اشیا کی جانب رغبت جن کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جیسا کہ **الانسان حریص علی**

ما منع. [یعنی انسان اس شے کی حرص کرتا ہے جس سے اس کو منع کیا جائے] سے ظاہر ہوتا ہے۔

دوم: گزشتہ لوگوں کے حالات پر غور کرنا۔

سوم: فراغت کو زائل کر دینا۔

۲۳۔ انسان کے لیے وہ وقت بہترین ہوتا ہے جس میں وہ مخلوق سے کنارہ کش ہو کر خالق سے نزدیک تر ہو جاتا ہے اور ان اشیاء سے قلب کو خالی کر دیتا ہے جن کی جانب سے مخلوق کا رجحان ہے اور درحقیقت بھی یہی ہے کہ جو اشیا اہلِ دنیا کے نزدیک پسندیدہ ہیں وہ اشیا ہرگز پسندیدگی کے قابل نہیں۔

۲۴۔ اگر متقدمین و متاخرین کے اعمال و حکمت کو مجتمع کر کے ولی و سادات ہونے کا دعویٰ دار ہو تو اس کو کسی طرح بھی عارفین کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ معرفت کا خلاصہ ہی یہ ہے کہ بندہ خلوص قلب سے اللہ اللہ کہنے کے ساتھ فقر و احتیاج اختیار کر لے۔

۲۵۔ معرفت کی تین قسمیں ہیں۔

اول: تمام امور میں غور کرنا تا کہ ان کو کس انداز سے قائم کیا گیا ہے۔

دوم: مقدرات کے سلسلہ میں یہ غور کرنا کہ ان کو کس طرح مقدر کیا گیا ہے۔

سوم: مخلوق کے بارے میں یہ غور کرنا کہ ان کی تخلیق کس طرح عمل میں آئی ہے۔

۲۶۔ جمع کا مفہوم یہ ہے کہ جس کو توحید میں جمع کیا گیا اور تفرقہ اس کو کہتے ہیں جس کو شریعت نے متفرق کر دیا ہے۔

۲۷۔ خدا کا راستہ بہت دور ہے اور صبر کرنا بہت دشوار ہے یعنی حصول کے ساتھ حکمت کو حاصل کرنا ہے اور انبیائے کرام کی ارواح کشف و مشاہدے کے عالم میں ہیں اور صدیقین کی ارواح قربت واطلاع میں ہیں۔

۲۸۔ تصوف اختیار و عدم اختیار کے اظہار کا نام ہے اور لغو چیزوں کو ترک کر دینے کا نام بھی تصوف ہے۔

۲۹۔ جس شے پر نفس و قلب راغب ہو اس کو ترک کر دینا توکل ہے۔

۳۰۔ حالتِ بھوک میں نماز پڑھنا اور جب طاقت نہ رہے تو سو جانے کا نام فقر ہے کیونکہ تین چیزوں سے اللہ تعالیٰ کبھی درویش کو خالی نہیں رکھتا یا تو قوت عطا کر دیتا ہے یا موت سے ہمکنار کر دیتا ہے تا کہ ہر شے سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔

ماخذ

۱۔ حلیۃ الاولیاء، امام ابو نعیم اصفہانی، [حصہ دہم] مترجم مولوی محمد یوسف تنولی، دارالاشاعت کراچی ، ۲۰۰۶ء

۲۔ صفۃ الصفوۃ امام ابن جوزی[جلد دوم] مترجم شاہ محمد چشتی سیالوی ، ادارہ پیغام القرآن، لاہور، ۲۰۱۲ء

۳۔ طبقات الصوفیہ، امام ابی عبدالرحمٰن محمد بن الحسین السلمی مترجم، شاہ محمد چشتی سیالوی، پیغام القرآن، لاہور، ۲۰۱۱ء

۴۔ قشیریہ، امام ابوالقاسم قشیری، مترجم پیر محمد حسن، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

۵۔ برکاتِ روحانی [اردو ترجمہ] طبقاتِ امام شعرانی، سیدی عبدالوہاب شعرانی مترجم مولانا محمد محفوظ الحق شاہ چشتی صابری، نوریہ رضویہ پبلی کیشنز، لاہور، ذوالحجہ ۱۴۳۰ھ/ دسمبر ۲۰۰۹ء

۶۔ آداب المریدین، مؤلف شیخ ضیاء الدین ابوالجیب عبدالقادر سہروردی، مترجم محمد عبدالباسط، تصوف فاونڈیشن، لاہور، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء

۷۔ عوارف المعارف، مؤلف شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی مترجم مولوی ابوالحسن مرحوم، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۴ء

۸۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فریدالدین عطار، تصحیح مولانا طفیل احمد جالندھری، ملک اینڈ کمپنی، لاہور

۹۔ سیر الاولیاء، میر خورد کرمانی، چرنجی لال، دہلی، ۱۳۰۲ھ

۱۰۔ نفحات الانس، مولانا عبدالرحمٰن جامی، مطبوعہ اللہ والے کی قومی دکان، لاہور

۱۱۔ لطائف اشرفی، حصہ اول، لطیفہ ۳، ص ۱۱۳

۱۲۔ لطائف اشرفی[جلد اول]، نظام یمنی، مترجم شمس بریلوی، لطیفہ ۱۵، ص ۶۱۹، سہیل پریس، کراچی، ۱۹۹۹ء

۱۳۔ سبع سنابل، ص ۴۱۷ تا ۴۱۹، لاہور

۱۴۔ سفینۃ الاولیاء، دارالشکوہ قادری، بذیل تذکرہ، ص ۸۶، لکھنؤ

۱۵۔ سیر الاقطاب، شیخ الہ دیہ چشتی صابری، مترجم پروفیسر محمد معین الدین دردائی، نفیس اکیڈمی، کراچی

۱۶۔ مراۃ الاسرار [سال تالیف ۱۰۴۵ھ تا ۱۰۶۵ھ]، شیخ عبدالرحمٰن چشتی صابری، مترجم کپتان واحد بخش سیال چشتی صابری، ص ۳۴۱ تا ۳۴۲، ۱۴۱۲ھ، لاہور

۱۷۔ اقتباس الانوار، شیخ محمد اکرم براسوی، مترجم کپتان واحد بخش سیال چشتی صابری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، محرم الحرام ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء

۱۸۔ مطلوب الطالبین، قاضی محمد بلاق دہلوی، مترجم پروفیسر لطیف اللہ مرحوم، مکتبہ رضویہ، دہلی، اشاعت ۱۹۹۹ء

۱۹۔ مراۃ ضیائی عکسی قلمی، مولانا رحمت علی ضیائی جے پوری

۲۰۔ شجرۃ الانوار فخری عکسی قلمی، مؤلف مولانا رحیم بخش فخری دہلوی، نسخہ نیشنل میوزیم کراچی، نسخہ حاجی پوری و نسخہ تونسوی

۲۱۔ مخزنِ چشت، خواجہ امام بخش مہارویؒ، مترجم پروفیسر افتخار احمد چشتی، فیصل آباد، ص ۱۵۹ تا ۱۶۰

۲۲۔ مناقب المحبوبین، حاجی نجم الدین سلیمانی فتح پوری، رام پور ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء

۲۳۔ خیر الاذکار، جامع مولوی محمد گھلوی، مرتبہ: ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، قلم کار بیٹھک، واہ کینٹ، ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء

۲۴۔ جواہر مودودی [قلمی عکسی]، مؤلف محمد اکرم براسوی

۲۵۔ مقابیس المجالس، ملفوظات حضرت خواجہ غلام فرید، جامع مولوی رکن الدین پرہاروی، مترجم کپتان واحد بخش سیال چشتی صابری، بزم اتحاد المسلمین، لاہور، ۱۴۱۱ھ

☆☆☆☆☆

ملفوظات نگاری: چند فکری اور فنی مباحث

ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر☆

[ا]

ملفوظات: روحانیت، روایت، تہذیب اور تہذیبی زندگی کی کوکھ سے پھوٹنے والی وہ صنفِ ادب ہے، جس میں قرونِ وسطیٰ کا پورا معاشرہ سانس لیتا تھا۔ بادشاہوں کے سیاسی اور سماجی جبر کے مظاہر بھی اس میں منعکس ہوتے تھے اور عوام کے دکھوں کے مناظر بھی۔ اس صنفِ ادب میں گیرائی بھی تھی اور گہرائی بھی۔ اس میں فکر و خیال کی جلوہ گری بھی تھی اور شعر و ادب کی جلوہ آرائی بھی۔ اس میں رنگ بھی تھے اور بے رنگی بھی۔ کتنے ہی زمانوں کی دانش اس کے منظر نامے سے منکشف تھی اور کتنے ہی صاحبانِ کشف کا وجدانی تجربہ اس کے آنگن میں جلوہ نما تھا۔ اس کے برعکس بادشاہوں کے درباروں میں لکھی جانے والی تاریخ: عوام اور عوامی زندگی کے مختلف اور متنوع رنگوں کی جمالیات کی امین نہیں تھی، کیونکہ درباداری اور اس کے مظاہر میں عوام کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔ یوں اس معاشرے میں عوام: خانقاہی نظام کی اس زندہ روایت سے جڑے ہوئے تھے، جس میں انھیں بنیادی اور اساسی اہمیت حاصل تھی۔ ملفوظات کا معنوی منظر نامہ بھی عوام کی جذباتی زندگی اور اس کی تہذیب سے وابستہ تھا، جس میں وہ زندہ تھے۔ اسی لیے اس میں عام آدمی کے دل کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں اور اس کی زندگی کے دکھ سکھ بھی اس کے بین السطور اپنی چھب دکھاتے ہیں۔ عوامی زندگی کی جتنی تصویریں ملفوظات کے آئینہ خانے میں منکشف ہوئی ہیں، اتنے تواتر، تسلسل اور عمدگی کے ساتھ ان کی عکس گری کسی بھی دوسری صنفِ ادب میں نہیں ہوئی۔

سلسلۂ چشتیہ میں ملفوظات نگاری کی روایت قدیم بھی ہے اور مسلسل اور متواتر بھی۔ برِصغیر پاک و ہند میں اس سلسلے کے آغاز کے ساتھ ہی ملفوظات کی جمع آوری کا سلسلہ بھی آغاز

☆ صدرِ شعبۂ اُردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

ہوا۔اگرچہ بعض محققینِ کرام ابتدائی مجموعہ ہائے ملفوظات کو منسوب اور جعلی قرار دیتے ہیں اور انھیں مستند نہیں گردانتے (۱)، حالانکہ ملفوظاتی ادب اور تصوف کی کتابوں میں تسلسل اور تواتر کے ساتھ ان مجموعوں کے حوالے بھی مذکور ہوئے اور چشت کے خانقاہی نظام میں ان کی خوشبو: فکری آفاق کے در و بام کو بھی معطر کرتی رہی۔ یہ مجموعے اتنے عام اور عوامی رہے ہیں کہ ان میں تحریف، الحاق اور تبدیلی کے عمل کو یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا، لیکن الحاق اور تحریف کی کارفرمائی کے یہ عوامل ان کے جعلی اور وضعی ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتے۔ چونکہ تاریخ کے مختلف ادوار میں وابستگانِ سلسلہ: عقیدت اور محبت کے پیشِ نظر ان ملفوظاتی کتابوں کے حصول میں سرگرمِ عمل رہے، اس لیے ان کی نقل نویسی کا سلسلہ بھی بہت عام رہا۔ ہر طرح کے کاتب اس کارِ خیر میں شریک رہے اور ان مجموعہ ہائے ملفوظات کی نقل نویسی کے دوران میں انھیں کھل کھیلنے کا موقع بھی میسر رہا۔ انھوں نے نسخوں کی نقل نویسی کے عمل میں احتیاط اور اعتدال کو ملحوظ نہیں رکھا، جس کی وجہ سے یہ نسخے ابتری کا شکار ہو گئے۔ ان میں لفظی تحریف بھی ہوئی اور معنوی بھی؛ ان میں تاریخی اغلاط بھی در آئیں اور زمانی بھی، لیکن یہ مجموعے چشتیہ سلسلے کے فکری اور معنوی مدار سے باہر نہیں گئے اور ان کا جمالیاتی آہنگ اپنے فکری نظام کی حقانیت پر گواہ رہا۔ ان ملفوظات کی فکری اور معنوی اپیل ہر دور میں صداقتِ احساس کے رنگ بکھیرتی رہی اور ان کا دائرۂ اثر اپنے تہذیبی مدار میں اپنی خوش آہنگی کا نقیب رہا اور ان کی بصیرت افروز تعبیر مختلف زمانوں کی فکری تربیت کا فریضہ انجام دیتی رہی اور ان کا دائرۂ اثر و نفوذ آج بھی وسعت آشنا ہے۔ بقولِ علامہ اخلاق حسین دہلوی:

> "کسی واقعے کا تاریخ سے وابستہ ہونا اور تاریخی اندراج کا صحیح ہونا بلاشبہ واقعے کو تقویت بخشتا ہے، اہلِ علم انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ تاریخ میں متعدد واقعات مختلف فیہ ہوتے ہیں اور تاریخی اندراجات بھی مختلف ہوتے ہیں، لیکن تاریخی اختلاف کی بنا پر انکار نہیں کیا جاتا، بلکہ صحت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ کتبِ ملفوظات میں سے اگر

کسی نسخے میں واقعہ کے ساتھ سنہ اور تاریخ وغیرہ صحیح نہیں، تو تصحیح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، واقعہ کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ یہ علمی و تحقیقی نقطۂ نظر ہے، جو علمی دنیا میں مروج ہے۔ غلط تاریخی اندراج کی بنا پر کسی کتاب کو جعلی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر صحت کا نقطۂ نظر یہی قرار پائے، تو ملفوظات ہی کیا، بہت بڑا علمی ذخیرہ جعلی قرار پائے گا، اس لیے اہلِ علم و اہلِ نظر اس روش کو از کارِ رفتہ جانتے ہیں۔ ملفوظات سے دلچسپی رکھنے والے خاص ہوں، یا عام، معدودے چند کے سوا تاریخی قدروں سے دلچسپی نہیں رکھتے، ان کے دل و دماغ نفسِ واقعہ سے متاثر اور کیف اندوز اور ہدایت کی نعمت سے سرفراز ہوتے ہیں، انھیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کوئی واقعہ کب ہوا؟ کس دن ہوا؟ کس تاریخ کو ہوا؟ کس مہینہ میں ہوا اور کس سنہ میں پیش آیا؟ یہ سوال اُٹھتا ہی نہیں ہے، بلکہ ان کے دل و دماغ روحِ واقعہ سے متعلق رہتے ہیں۔ بلاشبہ تاریخی صحت نہایت کارآمد اور مفید ہے، خصوصاً ان کے لیے جو تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ اصلاح کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں اور صحت مند معلومات فراہم کی جا سکتی ہیں، لیکن جن کتابوں کا وجود صدہا سال سے پایا جاتا ہے۔ ان میں اگر کسی تاریخی واقعے میں سقم پایا جائے، تو ان کو جعلی قرار دینا صحیح نہیں۔ یہ بھی اصول نہیں کہ اگر کسی کتاب کا کوئی قدیم ترین نسخہ دستیاب نہ ہو سکے، یا متداول کتابوں میں اس کا ذکر نہ ملے، تو اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے۔
۔۔۔ بہر حال کتبِ ملفوظات جو ہم تک پہنچی ہیں، وہ داخلی دلچسپی کی بدولت پہنچی ہیں، جس میں بلا امتیاز عقیدت مندوں کی دلچسپی کو دخل ہے۔ علمائ کی دلچسپی کے نقوش خال خال ہی ملتے ہیں، غالباً اس لیے کہ ان میں

درسِ عمل ہے اور عالمانہ قیل و قال نام کو بھی نہیں ہے۔ بہر حال ہم ان
عقیدت مندوں کی دلچسپی کے مرہونِ منت ہیں، جن کی بدولت ہم اپنے
روحانی اور تہذیبی سرمائے سے فیضیاب ہیں"۔(۲)

[۲]

برِ صغیر پاک و ہند میں ملفوظ نگاری کی صنف کا آغاز اور ارتقا سلسلۂ چشتیہ سے مخصوص اور متعلق رہا اور آج بھی ہے۔ اس سلسلے کے وابستگان میں ملفوظ نگار بہت نمایاں رہے۔ انھوں نے ہر دور میں اپنے مشائخ کے ملفوظات کی ترقیم میں اپنے حسنِ اظہار اور اندازِ نگارش کے متنوع اسالیب سے اکتسابِ فیض کیا اور ملفوظات نگاری کے باب میں نت نئے رنگوں کی آمیزش سے ایسے آداب اور قرینے تخلیق کیے، جن کی ماقبل متصوفانہ ادب میں مثال نہیں ملتی۔ حسن علا سجزی، علی بن محمود جاندار، دبیر کاشانی، حمید قلندر، امیر خرد اور سید محمد اکبر حسینی نے ملفوظ نگاری کی صنفِ ادب کو اتنے رنگ اور اسالیب عطا کیے، جو بعد میں آنے والے ملفوظ نگاروں کے ہاں کسی نہ کسی صورت میں اپنی بہار دکھاتے رہے اور آج بھی ان کا رنگ ماند نہیں پڑا۔ انھوں نے اپنے روایتی اور تہذیبی اسالیب سے بھی اکتساب کیا اور اس میں اپنے حسنِ تخلیق کی نادرہ کاری کے مظاہر کی رنگارنگی کے تاب ناک رویوں کو بھی شامل کیا، جس سے ان کا اسلوبیاتی آہنگ نئے موسموں کی نوید بن گیا۔ بقولِ مولانا عبدالماجد دریابادی:

"ہندوستان کے دنیائے فقر و تصوف میں ایک خاص شہرت و امتیاز سلسلۂ عالیہ چشتیہ کو حاصل ہے۔ ان خواجگانِ چشت کے 'پنجتن پاک' نے اپنی تعلیمات و ہدایات اپنے ملفوظات کے قالب میں چھوڑی ہیں۔ مختلف مجلسوں میں جو کلمے ان کی زبانِ مبارک سے نکلتے تھے، مریدانِ باصفا انھیں قلمبند کر لیتے اور مرتب کر کے ان ملفوظاتِ مبارک کو شائع کر دیتے۔ مرشدوں کے ان ارشادات کو جمع اور مرتب کرنے والے خود اپنی

اپنی نوبت پر صاحب ارشاد اور بانی سلسلہ ثابت ہوئے اور گو محدثین کی سی
تاریخیت اور سندِ متصل کا التزام بزم تصوف کی چیز نہیں۔ پھر بھی اپنے
حدود کے اندر شمع سے شمع اسی طرح روشن ہوتی رہی اور صدیوں تک چراغ
سے چراغ جلتا رہا"۔(۳)

پچھلی آٹھ صدیوں میں سلسلۂ چشتیہ کے ملفوظاتی ادب کے متنوع اسالیب بیاں اور انداز ہائے نگارش منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے، تو ان کی مہکار نے اس صنفِ ادب کے دائرۂ اثر و نفوذ کو ایسا بڑھاوا دیا کہ ان کی رنگا رنگی مختلف اور متنوع رنگوں میں پھیل گئی۔ سلسلۂ چشتیہ کے صوفیہ اور اس سلسلے کے عقیدت گزار اہلِ قلم نے اس صنف کو اسالیب نگارش کے اتنے رنگوں میں عکس انداز کیا ہے کہ اس صنف کی جلوہ آرائی متنوع جہات میں محوِ سفر رہی ہے اور اس کا انداز نگارش آج بھی نت نئے رنگوں سے ہویدا ہے۔ فوائد الفواد کی تحریر و تسوید سے قبل ایک طرز اظہار اور ایک عمومی تکنیک روشناسِ خلق ہو چکی تھی اور اس کی ہیئتی اور تکنیکی صورتِ اظہار میں ایک یکساں رنگ نمایاں تھا۔ انیس الارواح سے لے کر راحت القلوب تک کا چشتی ملفوظاتی ادب کا فنی پیرایۂ اظہار ایک ہی اسلوب کا آئینہ دار ہے۔ ان کے برعکس فوائد الفواد سے ایک نئے طرز احساس کا آغاز ہوتا ہے، جو فنی حوالے سے منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔ بعد ازاں اس کتاب کے زیرِ اثر ملفوظات کی صنف نے ہیئت اور تکنیک کے کئی لبادے اوڑھے اور کتنے ہی رنگوں میں آشکار ہوئی۔ سلسلۂ چشتیہ کا مابعد ملفوظاتی ادب فوائد الفواد کی فنی اور تکنیکی خوشبو سے معطر رہا ہے۔ مختلف ادوار میں ملفوظات کے مرتبین اور جامعین نے اس صنفِ ادب کو اپنی اپنی فکری بصیرت اور جمالیاتی معنویت کے تناظر میں گنجینۂ معانی کا طلسم کدہ بنانے کی سعی کی، لیکن اس مجموعے جیسی شہرت، عزت اور عظمت کسی دوسرے مجموعے کو میسر نہیں رہی۔ اس میں ادب کی چاشنی بھی ہے اور تاریخ کی عمل داری بھی۔ اس میں کہانی کی آمیزش بھی ہے اور تمثیل کی خوشبو بھی۔ اس میں رنگ بھی ہیں اور بے رنگی بھی۔ حسن علا سجزی کے اسلوبِ اظہار کو حضور نظام الدین اولیاؒ نے اور حمید قلندر

کے اسلوبِ نگارش کو نصیر الدین چراغ نے فقیرانہ طرزِ احساس سے تعبیر کیا تھا۔ وہ فقیرانہ طرزِ نگارش اس قدر مقبول ہوا کہ اس کی تعبیر اور تفسیر کا دائرہ کئی زمانوں تک پھیل گیا اور اس کی معنویت جاوداں قدروں کا اشاریہ بن گئی۔ بقولِ پروفیسر خلیق احمد نظامی:

''۷۰۷ھ تھا اور شعبان کی تیسری تاریخ۔ امیر حسن علاء سجزی اپنے مرشد شیخ نظام الدین اولیا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ اس وقت حاضرین سے گفتگو میں مصروف تھے اور خانقاہ کا پورا ماحول کچھ ایسا 'جنت نگاہ' اور 'فردوس گوش' بنا ہوا تھا کہ امیر حسن کے دل میں خیال آیا کہ اس ماحول کو الفاظ میں مقید کر لیں، تاکہ آنے والی نسلیں بھی ان روح پرور مناظر کی ایک جھلک دیکھ سکیں''۔ (۴)

ملفوظات کی تہذیب اور جمع آوری کے متنوع فنی اور تکنیکی اسالیب معرضِ اظہار میں آئے۔ تاریخ، دن اور وقت کی تعیین کے ساتھ مجالس کے ظاہری طرزِ اظہار اور اس کے خارجی خدوخال کی پیکر تراشی کے آہنگ بھی نمایاں ہوئے اور اس کے داخلی رویوں کی خوشبو کو کشید کرنے کا خوبصورت اہتمام بھی ہوا۔ بعض ملفوظاتی مجموعے موضوعاتی افکار کا لبادہ اوڑھ کر بھی جلوہ گر ہوئے۔ کچھ مجموعوں میں ارشادات اور اقوال کا اظہار: عمومی اور ہمہ گیر طرزِ احساس کی صورت میں متشکل ہوا۔ ان مجموعہ ہائے ملفوظات کی فکری، فنی اور تکنیکی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ متصوفانہ ادب کے فکری اور معنوی تناظر میں بعض ملفوظاتی مجموعے موضوعاتی افکار کا لبادہ اوڑھ کر تاریخی، سماجی، فکری، عرفانی، جمالیاتی، تہذیبی اور دینی حیثیت سے اتنے ہمہ رنگ اور ہمہ گیر رویوں کی خوش تمنائی کا اشاریہ بن گئے کہ اس کے معنوی آفاق دل کش بھی ہوئے اور دل کشا بھی۔ ڈاکٹر مظہر یٰسین صدیقی ندوی لکھتے ہیں کہ:

''مجلسی علم، تہذیبی کلام اور محفلی گفتگو ہونے کے سبب ملفوظات کے مضامین و موضوعات کی تعیین میں کسی نہ کسی تک سامعین و حاضرین کے

تہذیبی پس منظر، علمی اساس، فنی نوعیت، ترتیبی انداز اور ان سے متعلق دوسری چیزوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ موضوعات میں سامعین کا بھی حصہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی گفتگو، سوال، بحث سے اس کی تشخیص وتعیین میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں، مگر ایسا صرف دوطرفہ ملفوظات میں ہوتا ہے، جہاں سوال والتماس اور بحث کی اجازت ہوتی ہے، لیکن یک طرفہ ملفوظات میں سوال جواب کی گنجائش نہیں ہوتی اور صرف صاحبِ ملفوظات کلام اور سامعین صرف سنتے ہیں، وہاں مباحث وموضوعات کی تعیین سراسر صاحبِ ملفوظات کی اپنی ہوتی ہے۔ ایسے یک طرفہ موضوعاتی ملفوظات بالعموم شیوخِ وقت، اکابرِ عصر، صوفیائے دہر اور ان تمام افراد و طبقات کے ہوتے ہیں، جن کی تقدیس وتحریم، احترام واکرام وعظمت و سرفرازی، یا ان کے سامعین وحاضرین کی بے انتہا عقیدت، بے پایاں محبت اور بیکراں تعظیم لب کھولنے میں مانع ہوتی ہے۔ کبھی کبھی صاحبِ ملفوظات کا خوف وخفگی اور سامعین کی دہشت وخوفزدگی بھی اس کا سبب بن سکتی ہے۔ دوطرفہ ملفوظات میں صاحب وسامع کی شراکت کا سبب مجلس کا کھلا پن تو ہوتا ہی ہے۔ ان دونوں کی علمی اور تہذیبی شراکت بھی ایک اہم وجہ ہوتی ہے۔ اگر صاحبِ علم: فقیہہ، ادیب، شاعر، حکیم یا کوئی ہمہ جہت شخصیت ہے، تو سوال وجواب یا بحث یا مباحثہ کا دروازہ کھل جاتا ہے، جس طرح سامع کے صاحبِ علم وفضل ہونے سے اس کے وا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں"۔ (۵)

[۳]

ملفوظات کیا ہیں؟ جہانِ معانی کی جمالیاتی تہذیب کا خزینہ ہیں۔ یہ کسی بھی شیخ کی خوش

آثارِ مجالس کی بصیرت افروز گفتار کا مجموعہ ہوتے ہیں؛ ان میں مجلس آرائی کے رنگ بھی ہوتے ہیں اور اس کے مظاہر بھی؛ ان میں شیخ کی فکری اور تہذیبی شخصیت کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے اور خوشبو بھی۔ ان میں زندگی اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ منکشف بھی ہوتی ہے اور بے حجاب بھی؛ ان میں محبت کی مہکار بھی ہوتی ہے اور انسان دوستی کی پھوار بھی؛ ان میں تاریخ بھی ہوتی ہے اور روایت بھی؛ ان میں تمثیل کا رنگ بھی ہوتا ہے اور حکایت کا آہنگ بھی؛ ان میں نیکی اور رواداری کی ترغیب بھی ہوتی ہے اور صداقتِ احساس کی تہذیب بھی۔ ان کی فکری اور معنوی حدود اور قیود کا دائرہ اثر وسعت آشنا رہتا ہے۔ ان میں زندگی اور اس کی جمالیاتی تہذیب کے اتنے رنگ ہویدا ہوتے ہیں کہ وہ اپنے تمام تر اسالیب کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے۔ بقولِ علامہ اخلاق حسین دہلوی:

''ملفوظات مجموعہ ہوتے ہیں، ان بیانات کا جو اخلاقِ فاضلہ اور اعمالِ صالحہ کی ترغیب و تحریص کے لیے صوفی بزرگ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے مجمع میں بیان کیا کرتے تھے اور کرتے ہیں۔ ان میں سامعین کی استعداد کا؛ ان کے امراضِ قلبیہ کا دفعیہ اور ان کی روحانی ترقی کا پورا پورا لحاظ ہوتا ہے۔ اکابر اولیا اللہ کا ذکر بھی آجاتا ہے، جو اثر و تاثیر کو دوبالا کر دیتا ہے۔ ملفوظات کو ارشادات اور اقوال و فوائد بھی کہتے ہیں اور ان کے مجموعوں کو کتبِ اہلِ سلوک اور کتبِ مشائخ سے تعبیر کرتے ہیں''۔ (۶)

ملفوظاتی ادب کسی بھی شیخ کی گل افشانیِ گفتار کے خوش نما رنگوں سے نمو پذیر ہوتا ہے۔ اس سے گفتگو کا منہاج اور اس کے بین السطور حسنِ خیال کی جمالیات کا تہذیبی آہنگ بھی متشکل ہوتا ہے، جن سے مجلس کے فکری رویوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رویے کیونکر تہذیبی زندگی کی صداقت اور رعنائی کا پیکر اوڑھ کر طلوع ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد کے بقول:

''صوفیائے کرام، بزرگانِ دین اور علمائے عظام اپنے مریدوں، عقیدت مندوں اور شاگردوں کے سامنے اپنی مختلف مجلسوں میں وقتاً فوقتاً جو دینی و

علمی باتیں ،ان کی اصلاح اور اضافۂ معلومات کے لیے کرتے تھے ، حاضرینِ مجلس میں سے کوئی مستعد مرید و مسترشد انھیں سن کر اپنے لیے اور افادۂ عام کے لیے ضبطِ تحریر میں لے آتا تھا،انھی مرتب کردہ یادداشتوں کوملفوظات کہا جاتا ہے''۔(۷)

ملفوظات کے معنی ومفہوم اوراس کے دائرۂ کار کے ضمن میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری رقمطراز ہیں:

''ملفوظات کے معنی مقالات یا تقاریر کے ہیں۔یہ دراصل صوفیہ کے ہاں تعلیم وتربیت کا ایک رسمی طریقہ ہے۔مرید اپنے شیخ کے پاس بیٹھ کرکوئی عنوان شروع کردیتے ہیں اور شیخ اس عنوان پر اظہارِ خیال کرتا ہے۔کچھ ذہین اور ذی علم مرید اس گفتگو کونقل کرتے ہیں''۔(۸)

ملفوظات: مقالات یا تقاریر کا مجموعہ نہیں ہوتے، کیونکہ یہ دونوں اصطلاحیں ملفوظات کے فکری اور فنی دائرۂ کار سے یکسر مختلف اور متضاد رویوں کا اشاریہ ہوتی ہیں۔ملفوظات کسی بھی شیخ کی مجلسِ خوش آثار کا بیانیہ ہوتے ہیں۔ان میں کسی نوعیت کے تکلف یا بناوٹ کا عمل دخل نہیں ہوتا۔مرید کی طرف سے کسی عنوان کی پیش کش بھی کسی خوش کن منظر نامے کا سبب نہیں ہوتی۔ہاں کبھی کبھار کوئی سوال یا کوئی علمی اور مکاشفاتی الجھن گفتگو کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔بصورتِ دیگر شیخ کی نگاہِ پُر انوار اپنی گفتگو کا مواد کسی روحانی کیف یا کسی منظر کی وجدانی تعبیر سے کشید کرتی ہے،تو اس کے معنوی اور جمالیاتی مدار کا دائرۂ اثر پھیل کر ایک طرف ماضی اور دوسری طرف مستقبل کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ماضی اور مستقبل کا ایک نقطے پر اتصال شیخ کی بصیرت افروزی کا اظہاریہ بن جاتا ہے۔یہ طریقۂ تدریس اور تربیت رسمی بھی نہیں ہوتا، بلکہ اس میں غیر رسمی اندازِ نظر کی کارفرمائی اوراس کے متنوع مظاہر کی جلوہ آرائی اسے کسی رسمی یا روایتی اسلوب کا پابند نہیں رہنے دیتی، بلکہ اس کو ایک ایسا پیرایۂ اظہار عطا کرتی ہے، جو متنوع رنگوں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اپنے

اظہاریے میں کسی رسم وراہ کا پابند نہیں ہوتا۔اس میں شیخ کے مزاج کی رعنائی اور مجلس کے ماحول کی زیبائی کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔اس میں جو رنگا رنگی ہے،وہ اس کے انھیں متنوع اور مختلف رویوں کی مرہونِ منت ہوتی ہے، کیونکہ رسمی طریق اور منہاج تو اس کے راستے کی دیوار بن جائے اور اسے زمان ومکاں کی قیود سے ماورانہ ہونے دے:

"سلسلۂ چشتیہ صرف سیر وسلوک کا ایک طریقہ اور ایک روحانی نسبت ہی نہیں، بلکہ انسانی شعور کی ایک خاص کیفیت؛ ایک تمدنی مزاج اور ایک تخلیقی طرزِ احساس کا نام ہے۔اسی لیے وہ دنیائیں جو اس سلسلے کی خانقاہوں کے گرد تعمیر ہوئیں،ان میں ایک خاص انداز کی جامعیت اور ان کے تخلیقی مزاج میں ایک نایاب گداز پایا جاتا ہے۔وہ کیفیتِ قلب جس سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے، پوری اسلامی دنیا میں یکتا اور منفرد حیثیت کی حامل ہے"۔(۹)

اس لیے صاحبِ ملفوظ کے کلامِ خوش بیان میں تاثیر کے رنگ دیدنی ہوتے ہیں۔وہ جب ہم کلام ہوتا ہے، تو گویا پھول جھڑتے ہیں۔اس کی خوش کلامی اپنے اندر اتنے رنگ رکھتی ہے کہ کوئی بھی سامع اس کی گل افشانیِ گفتار کے دائرے سے باہر نہیں نکل پاتا۔مجلس میں ہر طرف اس کے کلام کی خوشبو پھیل جاتی ہے اور در و دیوار کو بھی وجد میں لے آتی ہے۔یہ تاثیرِ کلام اس کے باطن کے رنگ رس اور اس کی داخلی خوشبو سے وجد آفریں رہتی ہے اور پھر اسی کے آہنگ سے اپنا ایک فکری اور جمالیاتی نظام بھی مرتب کرتی ہے۔بقول ڈاکٹر مظہر یٰسین صدیقی:

"ملفوظات زندگی کے علمبردار ہوتے ہیں، جو وسعت اور تنوع کی عادی اور متقاضی ہے، اس لیے ان کے ملفوظات میں دوسرے دائروں اور قانون کے رنگ بھی ملتے ہیں"۔(۱۰)

ملفوظ نگاری کی صنف اپنی ہیئت اور اسلوب میں اپنا ایک الگ نظام رکھتی ہے۔ آغاز ہی سے اس صنفِ ادب کو سلسلۂ چشتیہ کے ساتھ خاص فکری اور تہذیبی مناسبت رہی ہے۔ اس سلسلے کے عقیدت گزاروں نے اس صنف کو ایسا معنوی، فکری، فنی اور تکنیکی اسلوب عطا کیا کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ انھوں نے اس صنف کے آداب کی ساخت پرداخت اور اس کے دائرۂ اثر کی ترتیب و تہذیب میں اہم کردار ادا کیا۔ ہر ملفوظ نگار نے اس صنف کے فکری اور فنی دائرے کو ایک نیا رنگ اور آہنگ عطا کیا اور یوں یہ صنفِ ادب مختلف مراحل سے گزرتی رہی اور اس کا مزاج بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا گیا۔ حسنِ کلام کے تہذیبی آفاق سے پھوٹنے والی یہ صنف: خانقاہی ماحول سے ہم آمیخت ہوئی، تو خود ایک تہذیب کی علامت بن گئی۔ صاحبِ ملفوظ کی خوش کلامی اس صنف کی حیاتِ دوام کا سندیسہ ہوئی، تو اس کا رنگ پھیلنے لگا اور پھر اس قدر وسعت پیدا ہوئی کہ کئی اصناف کا رنگ اور آہنگ اس کے آگے ماند پڑ گیا اور بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی:

> ”تھوڑی دیر کے لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زمین اور مکان کی پہنائیاں سمٹ گئی ہیں اور ہم اسی ماحول میں سانس لینے لگے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندی قرونِ وسطیٰ کی کوئی سماجی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک صوفیہ سے پورے طور استفادہ نہ کیا جائے“۔(۱۱)

ملفوظات نگاری کی صنف اپنے اندر امکانات کی ایک دنیا بسائے ہوتی ہے۔ اس میں ادب و شعر کی چاشنی بھی ملتی ہے اور فکر و فلسفے کا ذائقہ بھی۔ اس میں تاریخ کا پس منظر بھی ہوتا ہے اور تہذیب کا منظر نامہ بھی۔ اس میں بادشاہوں کا ذکر بھی آ جاتا ہے، لیکن اصل تخاطب عوام سے ہوتا ہے۔ اس صنفِ اظہار کے علاوہ کوئی بھی دوسری صنف: عوام اور عوامی زندگی کے اتنی قریب نہیں رہی۔ اس کے تناظر میں عوام اور ان کی زندگی کے رنگ رس اپنی تمام تر جہات کے ساتھ منکشف ہوئی ہے، کیونکہ ملفوظاتی ادب کے برعکس:

''عوام کی زندگی اور ان کے مسائل کی کہیں کوئی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی۔ملفوظات ہمارے تاریخی مآخذ کی اس تکلیف دہ کمی کو ایک حد تک پورا کر دیتے ہیں۔ان میں عوام کے دلی جذبات،ان کی پوشیدہ آرزوئیں، کشمکشِ حیات میں ان کی ہار جیت،ان کی مایوسیاں اور پریشانیاں،ان کی معصوم مسرتیں۔۔۔سب ہی محفوظ ہوگئی ہیں۔یہ عام عقیدہ تھا کہ مشائخ کو'نفس گیرا' حاصل ہوتا ہے،جس کے ذریعے وہ انسان کی اندرونی کیفیات اور پوشیدہ خواہشات کا اندازہ لگا لیتے ہیں،اس لیے لوگ بالعموم اپنا مافی الضمیر کسی تکلف یا رکاوٹ کے بغیر ان کے سامنے بیان کر دیتے تھے۔۔لڑکی کی شادی کی فکر ہو،یا حاکم کی ناراضی سے پریشانی،معاشی تنگی سے اداسی ہو،یا علالت کی بے چینی۔۔۔روزمرہ کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے مسئلے کے متعلق ان مشائخ سے رجوع کیا جاتا تھا۔ملفوظات میں جگہ جگہ اس نوعیت کے واقعات ملتے ہیں،جن سے اس دور کی بڑی دلچسپ تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے''۔(۱۲)

سلسلۂ چشتیہ کی تاریخ اور روایت میں ملفوظاتی ادب راہِ سلوک کے مسافروں کے لیے زادِراہ اور لازمۂ سفر ہے۔صدیوں سے یہ چشتی خانقاہوں میں مروج نصابِ تعلیم کا جزوِلازم رہا ہے۔مرید اور سالک دونوں اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس سے کسبِ فیض کرتے رہے ہیں اور یہ خوش آثار نصابِ تربیت آج بھی اپنی تمام تر جمالیات کے ساتھ رواج پذیر ہے۔

حواشی اور حوالے:

(۱) پروفیسر محمد حبیب پہلے محقق ہیں،جنھوں نے سلسلۂ چشتیہ کے اولین ملفوظاتی ادب کو شک اور شبے کی نگاہ سے دیکھا اور ان مجموعوں کو وضعی اور جعلی قرار دیا۔ان کے بعد کئی محقق اسی نظریے کے حامی اور پرچارک رہے۔

ابتداً میں راقم بھی پروفیسر صاحب کے علمی اور تحقیقی کام سے بے پناہ رغبت اوران سے اثر پذیری کی وجہ سے ان مجموعوں سے اجتناب برتتا رہا اوران کے زیرِ اثر انھیں جعلی اور منسوب گردانتا تھا۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن کے تحقیقی مقالات (مطبوعہ در معارف، اعظم گڑھ) اور علامہ اخلاق حسین دہلوی کی کتاب آئینۂ ملفوظات کے مطالعے کے بعد جب حقائق منکشف ہوئے، تو راقم نے الحمدللہ اپنے سابقہ خیالات سے رجوع کر لیا۔ ان مجموعہ ہائے ملفوظات میں تاریخی اور زمانی اغلاط یقیناً راہ پا گئیں، لیکن یہ مجموعے ان فلک آثار بزرگوں کی خوشبوئے دلنواز کا مرقع ہیں۔

(۲) آئینۂ ملفوظات : کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی: بار اول ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء: ص ۷۲۔۷۳

(۳) تصوفِ اسلام : ناشران قرآن لمیٹڈ، لاہور: س ن: ص ۱۲۸

(۴) ملفوظات کی تاریخی اہمیت مشمولہ نذرِ عرشی : مختار الدین احمد و مالک رام (مرتب): مجلسِ نذرِ عرشی، نئی دلی: ۱۹۶۵ء: ص ۴۳۵)

(۵) ملفوظات کا اسلوب مشمولہ سہ ماہی کاروانِ ادب، لکھنؤ: اپریل تا جون ۱۹۹۷ء: ص ۷۳۔۷۴

(۶) آئینۂ ملفوظات : ص ۲۸

(۷) ملفوظاتِ فاضل بریلوی مشمولہ سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ: شمارہ ۲: جلد ۳۵: ۱۹۹۸ء: ص ۵

(۸) جہانیانِ جہاں گشت : ص ۲۳۷ بحوالہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند (جلد سوم): ڈاکٹر محمد باقر و ڈاکٹر وحید مرزا (مرتبین): پنجاب یونی ورسٹی، لاہور: بارِ اول ۱۹۷۱ء: ص ۱۳۳

(۹) پیش لفظ از سراج منیر مشمولہ نقدِ ملفوظات : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور: بارِ اول ۱۹۸۹ء: ص ۱۴

(۱۰) ملفوظات کا اسلوب مشمولہ سہ ماہی کاروانِ ادب : اپریل تا جون ۱۹۹۷ء: ص ۷۳

(۱۱) ملفوظات کی تاریخی اہمیت مشمولہ نذرِ عرشی : ص ۴۴۵

(۱۲) محولہ بالا: ص ۴۳۶۔۴۳۷

☆☆☆☆☆

کتب خانہ مولانا محمد علیؒ مکھڈی

محمد ساجد نظامی

مولانا محمد علیؒ مکھڈی کے نام سے منسوب کتب خانہ مکھڈ شریف میں واقع ہے۔ ضلع اٹک کی تحصیل جنڈ میں واقع یہ تاریخی قصبہ جہاں اپنے اندر کئی خوبیاں رکھتا ہے وہیں اس کی شہرت کتب خانہ کے باعث علمی حلقوں میں موجود ہے۔ اس کتب خانہ کی بنیاد حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی نے رکھی۔ آپؒ بٹالہ (امرتسر) ۱۱۶۴ھ مطابق ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی والدین وصال فرما گئے۔ بعد ازاں آپؒ کی پرورش کی ذمہ داری اُن کے بڑے بھائی مولانا عبد الرسولؒ نے اُٹھائی۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن میں حاصل کی۔ پھر بڑے بھائی کی اجازت سے حصولِ علم کے لیے گھر سے سامانِ سفر باندھا۔ بہاولپور، جسیال (تلہ گنگ) سے ہوتے ہوئے مکھڈ شریف تشریف لائے۔ اس وقت یہاں کی درس گاہ میں مولانا محکم الدینؒ درس دیا کرتے۔ مولانا کے حلقۂ درس میں بیٹھنے کے بعد پھر کسی اور مدرس یا درس گاہ کی خواہش نہ رہی۔ دل جمی کے ساتھ تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد مولانا محکم الدینؒ کسی اور مقام پر درس و تدریس کے لیے تشریف لے گئے۔ مولانا محمد علیؒ مکھڈی بھی آپ کے ہمراہ ہو لیے۔ مولانا محکم الدینؒ کا وہیں وصال ہو گیا۔ تجہیز و تدفین کے بعد مولانا محمد علیؒ مکھڈی، مکھڈ شریف تشریف لائے تاکہ سامانِ سفر لے کر کسی اور درس گاہ کی طرف نکلیں۔ جب یہ خبر اہلِ قریہ تک پہنچی تو سبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی؛ کہ مولانا محکم الدینؒ تو اب اس دنیا سے پردہ فرما گئے، اُن کی جلائی گئی علم کی شمع کو روشن رکھنا ہے؛ سو آپ اس درس گاہ میں تعلیم و تعلم کے سلسلے کو جاری رکھیں تاکہ علم کی روشنیاں یونہی بکھرتی رہیں۔ جب مولاناؒ نے درس کا سلسلہ شروع کیا تو پھر آپ کے حلقۂ درس میں مولانا شمس الدین سیالویؒ، مولانا حافظ عابد جی مہارویؒ اور مولانا زین الحق والدین جیسے نابغۂ روزگار شاگرد آ کر بیٹھے؛ جن میں سے ہر ایک سے ایک عالم منور ہوا۔

حضرت مولاناؒ قریباً اٹھارویں صدی کی نویں دہائی میں مکھڈ شریف تشریف لا چکے

تھے۔ کتب خانہ ابتدا میں آپ کے نام سے منسوب مسجد (مسجد حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی) شہر کے عین وسط میں واقع تھی [یہ مسجد اب بھی اُس دور کی عظمتِ رفتہ کو یاد دلاتی ہے] کے کسی حجرہ میں موجود تھا۔ مولاناؒ کے وصال [۲۹ رمضان المبارک۔ ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء] کے بعد کتب خانہ بھی درس گاہ [بارہ دری] سے منسلک ایک کمرہ میں منتقل ہوا۔ حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی کے وصال کے بعد اُن کے خلفا نے درس گاہ کی ترویج میں شب و روز مختص کیے۔ مولانا حافظ عابد جیؒ مہاروی [۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء، مولانا زین الحق والدینؒ مکھڈی [۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء، مولانا غلام محی الدینؒ مکھڈی ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء، مولانا محمد احمد الدینؒ مکھڈی ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء، مولانا محمد فضل الدینؒ مکھڈی [۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء] اور مولانا فتح الدین مدظلہ العالی [پ۔ ۱۹۴۲ء]؛ ان سب حضرات نے اپنے اپنے ادوار میں کتب خانہ کی حفاظت، کتب کے اضافہ اور دیگر امور کی انجام دہی میں اپنی خدمات پیش کیں۔

مرورِ ایام کی بدولت یہ علمی سرمایہ بھی متاثر ہوا، مختلف علوم پر کچھ کتابیں علما کے ذوقِ مطالعہ کی نذر ہوئیں۔ اور یہ کوئی انھونی نہ تھی۔ برصغیر پاک و ہند کے ہر کتب خانہ کو ایسے باذوق علما ملے جنھوں نے اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔ استادِ محترم جناب نذر صابریؒ [م۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۱۳ء] نے اٹک کے ایک ایسے پروفیسر کی داستان بھی مجھے سنائی تھی کہ جو ظالم مولاناؒ کے کتب خانہ سے "ہیر" کا ایک خطی نسخہ اپنے ذہنی اپچ کے باعث چرا کر غالباً پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں جمع کروا آیا۔ جناب کا خیال تھا کہ "مولوی ہیر کو کیا جانیں" اور یہ مصرع بھی جناب نذر صابریؒ کے سامنے موصوف پروفیسر نے خود گنگنایا تھا۔ کفِ افسوس مل کے رہ گیا حضرت کی علمی فراست پر، آج وہ محفوظ ہاتھ بھی غیر محفوظ ہو گئے۔ یونیورسٹی لائبریریوں کے خطی نسخوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے اس پر بحث نہیں، مطبوعہ نسخے ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔

اس وقت کتب خانہ میں موجود کل کتب و رسائل ۱۵،۵۰۰ سے زائد ہیں۔ خطی نسخے ۱۲۰۰ ہیں، جن میں عربی، فارسی اور پنجابی کے نسخے شامل ہیں۔ عربی کتب ۴۰۰۰، فارسی ۳۰۰۰،

اُردو ۶۵۰۰، پنجابی ۵۰۰، پشتو ۳۰۰، انگریزی ۵۰۰، سندھی اور ہندی زبان میں بھی چند کتب موجود ہیں۔ ابتدائی فہرست سازی پر کام کا مکمل ریکارڈ محفوظ نہیں۔ شاید اس پر کام نہیں کیا گیا۔ کام ہوا ہے تو دست بردِ زمانہ کی نذر ہوا۔ ابتدائی فہرستوں میں ایک نامکمل سی فہرست رجسٹر ڈ میں محفوظ ہے۔ باقاعدہ فہرست سازی پر کام گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، اٹک کے کتابدار جناب نذر صابریؒ نے شروع کیا۔ اس کام کا آغاز ۱۹۶۶ء میں ہوا۔ صابری صاحب کئی بار مکھڈ شریف تشریف لائے۔ اُن کے ساتھ ان کے رفیق کار تشریف لاتے؛ جو علم وفن کے دلدادہ ہوتے۔ فہرست سازی کے لیے بڑی تقطیع کا رجسٹر ڈ پرنٹ کروایا گیا۔ جناب نذر صابری نے اس کام کے بارے میں پہلے صفحہ پر تحریر کچھ یوں لکھی۔

"فہرستِ مسلسل کتب خانہ مولانا محمد علیؒ، مکھڈ شریف

مرتبہ: نذر صابری

سید رفیق بخاری (شریک دورۂ اول وسوم)

کنور خالد محمود (شریک دورۂ اول ودوم)

افضال علی خان (شریک دورۂ دوم)"

فہرست سازی کے کام کی نوعیت اور مختصر تعارف جناب نذر صابری نے ان الفاظ میں کرایا ہے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم: موسم گرما ۱۹۶۶ء میں ڈپٹی کمشنر کی ایک چھٹی ہمارے پرنسپل چوہدری ظہور احمد ایم اے کے نام آئی جس میں انھوں نے اپنے دورۂ مکھڈ کا ذکر کیا اور کتب خانہ مولانا محمد علیؒ کے نوادرات کی تعریف کی، اور ان سے یہ فرمائش کی کہ وہ اپنی درس گاہ کے لائبریرین کو اس کتب خانہ کی ترتیب نو کے لیے مکھڈ روانہ کریں۔ میں نے اس کتب خانہ کو ۱۹۶۳ء میں سرسری نظر

سے دیکھا تھا۔ اور جدید پیمانوں پر اس کی ترتیبِ نَو کی اشد ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ اپنی اس دبی ہوئی آرزو کے پورا ہونے کا موقع فراہم ہوتا دیکھ کر میں نے فوراً آمادگی کا اظہار کر دیا اور جولائی ۱۹۶۶ء میں سید رفیق بخاری اور کنور خالد کے ساتھ کتب خانہ کو امعانِ نظر سے دیکھا، اس کی ضروریات کا جائزہ لیا، کچھ کام اربابِ بسط و کشاد کو سونپے اور کچھ اپنے ذمہ لیے۔ اس دورہ میں ہم نے 786 کتابیں اس رجسٹر پر چڑھائیں (یہ رجسٹر اور پانچ ہزار چھپی ہوئی چٹیں (Book plates) ہماری فرمائش پر سرکاری خرچ پر تیار ہوئیں) اور واپسی پر پرنسپل صاحب کی معرفت ڈپٹی کمشنر کو تحریراً اپنی کارگزاری اور تجاویز سے آگاہ کیا۔ اپنے دوسرے دورے میں (دسمبر1966) 1651 تک کی کتابیں درج کیں اور ان سب درج شدہ کتابوں پر (Numberin Machine) سے عددِ مسلسل ثبت کیے۔ ان ہی خطوط پر کام کرتے ہوئے اہلِ کتب خانہ نے ایک رَف رجسٹر پر 3584 نمبر تک کتابیں درج کر کے یہ رجسٹر ہمیں کیمبل پور [اٹک] بھیج دیا۔ تا کہ ان کو اصل پر چڑھا دیا جائے۔ ان کے اس تعاون سے جو دراصل ان کا اپنا ہی کام تھا ہمیں ایک گونہ خوشی ہوئی۔ اب اس رجسٹر پر کتب خانہ کی تمام موجود مطبوعہ کتابیں درج ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد ڈپٹی کمشنر موصوف کا تبادلہ ہو گیا اور ساتھ ہی سرکاری امداد کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تاہم اگست 1968 میں سید رفیق بخاری اور راقم الحروف، مولانا فتح الدین کے اصرار پر ان کے ساتھ دو روز کیلئے مکھڈ گئے۔ تمام فارسی مخطوطات کو جو 3584 نمبر سے 3894 تک دیکھی جا سکتی ہیں بالتفصیل درج کیا۔"

جناب نذر صابری صاحب کا ذوق اور لگن اس کام کو بڑھاوا دیتے رہے۔ انھوں نے ۲۳۴ کتب کی مختصر فہرست پر ایک کتابچہ "مختصر فہرست مخطوطات فارسی کتب خانہ مولانا محمد علی

مکھڈی'' کے عنوان سے مجلس نوادراتِ علمیہ'' اٹک سے شائع کیا۔ اگر چہ یہ فارسی مخطوطات کی مکمل فہرست نہ تھی۔ بہت سے مخطوطات ابھی باقی تھے۔ اس فہرست کے بعد اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے اسکالر خطیب رحمانی نے ۱۹۷۵ء میں فارسی، عربی اور پنجابی مخطوطات کی فہرست تیار کی جس میں کتب خانہ کے ۶۳۱ مخطوطات شامل کیے گیے۔ کتب خانہ مولانا کے ساتھ اس فہرست میں کتب خانہ خانقاہ سراجیہ مجددیہ، کندیاں (میانوالی) کے ۱۵۰ مخطوطات، کتب خانہ مولانا محمد الدین مکھڈی [م۔ ۱۹۷۵ء] جسے خطیب رحمانی نے ''کتب خانہ ثانی مولانا محمد الدین صاحب مکھڈی مدظلہ چشتی'' کے عنوان سے موسوم کیا، کے ۴۸۰ مخطوطات، کتب خانہ مدرسہ محمودیہ، خانقاہ تونسہ شریف، ضلع ڈیرہ غازی خان کے ۴۲۱ مخطوطات، حضرت سید مصری شاہ رضوی لائبریری، نصرپور، سندھ کے ۲۲۶ مخطوطات، جامعہ الراشدیہ، پیر گوٹھ، درگاہ شریف پیر پگارو صاحب، خیر پور، سندھ ۳۶۶ مخطوطات، قاضی محمد عبداللہ صاحب، مانسہرہ (ہری پور ہزارہ) ۲۰ مخطوطات اور کتب خانہ کاظمیہ، ٹھینگر، مظفرآباد (آزاد کشمیر) کے مخطوطات شامل ہیں۔

۱۹۷۷ء میں معروف ایرانی اسکالر اور مخطوطہ شناس جناب محمد حسین تسبیحی نے ''کتاب خانہ ہائے پاکستان'' جلد اوّل میں کتب خانہ مولاناؒ کے ۴۲، اہم خطی نسخوں کا تعارف کرایا۔ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ مطابق دسمبر ۱۹۷۸ء میں جناب نذر صابری نے کتب خانہ مولاناؒ کے ایک اہم فارسی خطی نسخہ ''غایۃ الامکان فی معرفۃ الزمان والمکان'' کو مبسوط مقدمہ کے ساتھ ''مجلس نوادراتِ علمیہ، اٹک کے زیر اہتمام شائع کیا۔ یہ نسخہ شیخ تاج الدین محمود بن خداداد اشنوی کی تحریر تھی۔ ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۹۹۷ء ڈاکٹر احمد خان نے ''فہرس المخطوطات العربیہ الاسلامیہ فی باکستان'' جز الاول میں اس کتب خانہ کے اہم عربی مخطوطات کو شامل کیا۔ انھوں نے [مکتبة المدرسه العالية للمولوی محمد علی (احمد الدین) بمکھد، باکستان] کے نام سے ۲۶ مخطوطات، [مکتبة المدرسه العالية للمولوی محمد علی (محمد الدین) بمکھد، باکستان] کے ۲۸ مخطوطات، [مکتبة المولوی محمد علی

مکھڈی(مولوی زین الدین) ترک[ترگ] مقا طعۃ میا نوالی، پاکستان] کے ۲ مخطوطات شامل کیے ہیں۔

ملک ریاض الدین اعوان نے ''مکھڈ شریف'' کے عنوان سے ''اٹک فیسٹیول'' اٹک، ضلع کونسل، ۱۹۹۲ء میں بھی کتب خانہ کا مختصر تعارف شامل کیا۔ ۲۰۰۷ء میں ''زیارت لائبریری مکھڈ شریف کے چند فارسی مخطوطات'' کے عنوان سے راقم کی تحریر ''دریافت'' نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد میں شائع ہوئی۔ جناب نذر صابری نے ۲۰۱۲ء میں کتب خانہ کے ایک اوراہم فارسی مخطوطہ ''منہج الرشاد لنفع العباد'' کو مرتب کیا، جو مجلسِ نوادراتِ علمیہ۔ اٹک سے شائع کیا گیا۔ یہ شیخ زین الدین الخوافی ہروی سہروردیؒ کا تحریر کردہ رسالہ ہے۔ جس کا ایک قدیمی نسخہ کتب خانہ کی زینت ہے۔ ۸۳۸ھ کا مکتوبہ یہ خطی نسخہ دنیا بھر میں موجود اِس کتاب کے دستیاب نسخوں پر زمانی تقدم رکھتا ہے'' کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈی کے پنجابی خطی نسخے'' کے عنوان سے ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے ۲۷ پنجابی خطی نسخوں کی مفصل فہرست تیار کی، جو الخیر یونیورسٹی کے تحقیقی مجلّہ ''تحقیقی زاویے'' شماہ :۴، جولائی۔ دسمبر ۲۰۱۴ء'' میں شائع ہوا۔ ''کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈی، کی اُردو علمی وادبی کتب کی توضیحی فہرست [مطبوعہ قبل اگست ۱۹۴۷ء] کے عنوان سے نادرن یونیورسٹی، نوشہرہ سے ایم۔فل سطح کا مقالہ لکھا گیا۔ اس میں ۳۴۰ مطبوعہ اُردو کتب کو شامل کیا گیا۔ اس کے مقالہ نگار، ذوالفقار حسین شاہ ہیں اور نگرانِ مقالہ ڈاکٹر سید اشفاق حسین بخاری تھے۔

اہلِ ذوق کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ کہ اس دورافتادہ ایک چھوٹی سی بستی میں اتنا عظیم اوراہم علمی ذخیرہ کیسے جمع ہوا۔ جب ہم کتب خانہ کی تاریخ وروایت پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جس دور میں حضرت مولاناؒ نے اس درس گاہ کی ازسرِ نو تنظیم فرمائی تو آپ کی علمی شہرت دور ونزدیک سے علم کے متلاشیوں کو کشاں کشاں مکھڈ شریف آنے پر مجبور کر رہی تھی۔ علاوہ ازیں چونکہ یہ زمانہ برصغیر پاک وہند میں انگریز مشنری کے تسلط کا ابتدائی

زمانہ ہے اور اس دور میں ملک انتہائی بدنظمی وابتری کا شکار تھا، تو ایسے حالات میں علمی درسگاہیں ان علاقوں میں زیادہ پنپ رہی تھیں۔ جہاں شورشوں کا گزر کم تھا۔ مکھڈ شریف کا قصبہ بھی ایک ایسا ہی مقام تھا جہاں یہ علمی درسگاہ بجتی تھی۔ سو مولانا ؒ کی محنت اور علم کے ساتھ ان کی وابستگی ومحبت نے اس درس گاہ کو جلد شہرتِ دوام عطا کیا۔ اٹھارویں صدی کے آخری دو عشروں اور انیسویں صدی کی ابتدائی چار دہائیوں میں اس درس گاہ کو مولاناؒ جیسا عالم بے بدل اور منتظم اعلیٰ میسر رہا۔ مولاناؒ کے وصال ۱۸۳۷ء کے بعد ۹ سال تک خلیفۂ اول مولانا حافظ عابد جی مہارویؒ نے اس درس گاہ اور کتب خانہ کی خدمت کی۔ ۱۸۴۵ء سے ۱۸۷۸ء تک کے ۳۳ سال حضرت مولانا محمد علیؒ کے خلیفہ ثانی حضرت مولانا زین الحق والدینؒ مکھڈی کی سرپرستی اس درس گاہ کو حاصل تھی، جو کتاب کے ساتھ ایک خاص محبت رکھتے۔ ہندوستان بھر کے اشاعتی اداروں سے کتابیں، کتب خانہ کے لیے منگوائی جاتیں۔ مختلف موضوعات پر درس گاہ کے ذہین اور محنتی طلبا سے مقالہ جات لکھوائے جاتے۔ چونکہ اس زمانے کے طلبا اچھے کاتب بھی ہوتے۔ سو کسی ایک موضوع پر ایک خوش خط مخطوطہ کتب خانہ کی زینت بنتا۔ پھر علمی مراکز سمرقند و بخارا سے طلبا اپنے ساتھ کتب لاتے، جو حضرت زین الحق والدینؒ کو تحفۃً پیش کی جاتیں۔ مکھڈ کی پراچہ فیملی جو تجارت کے ساتھ منسلک تھی جس علاقہ میں بھی تجارت کی غرض سے جاتے کوئی نہ کوئی مطبوعہ یا خطی نسخہ اپنے مربی کو نذر کرتے۔ حضرت زین الحق والدینؒ کے احوال میں ہمیں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں، جن میں کتاب کے ساتھ آپ کی وابستگی ومحبت کا عجب رنگ نظر آتا ہے۔ تونسہ مقدسہ میں عرس مبارک حضرت پیر پٹھان شاہ محمد سلیمان تونسویؒ پر تشریف لے جاتے تو وہاں پر آئے ہوئے کتب فروش آپ کے قیام تک خانقاہ ہی میں ٹھہرے رہتے۔ آپؒ واپسی پر تمام کتب خرید فرما لیتے۔ علاوہ ازیں اگر آپ کسی سے ناراض ہوتے تو آپ کو کتاب پیش کر کے یارانے کی صورت نکل سکتی۔ حضرت زین الحق والدینؒ کے وصال ۱۸۷۸ء کے بعد آپؒ کے نواسے حضرت غلام محی الدین احمدؒ سجادہ نشین ہوئے۔ ۱۸۷۸ء سے ۱۹۲۰ء تک کا ۴۲ سالہ یہ دور، درس گاہ و کتب خانہ کا زریں دور ہے۔

حضرت جہاں خود علم وفضل میں بلند مقام پر فائز تھے وہیں ایک اچھے کاتب بھی تھے۔ اپنے ذوق کی تشفی کے لیے کتابت کرتے۔ کتب خانہ میں سراجی (علم میراث) کا نسخہ آپ کی کتابت کیا ہوا محفوظ ہے۔

حضرت مولانا محمد علیؒ اور آپ کے خانوادہ سے منسلک علما نے ہمیشہ اپنے خاندان کو وصیت کی، کہ ہمارے وصال کے بعد تمام کتب کو مولاناؒ کے کتب خانہ میں محفوظ کروا دیا جائے۔ اب بھی کتب کی آمد کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ حضرت مولانا کے خلفا نے بعض علما کی اولاد سے کتب اس وعدہ پر بھی کتب خانہ میں منتقل کیں کہ اگر آپ کی اولاد میں سے کوئی بچہ عالم ہوا۔ جو، اِن کتب کا حقیقی وارث ہوگا تو اسے یہ کتب ذوق کی بنا پر واپس دے دی جائیں گی۔ مولانا عبدالروفؒ انجروی (انجرا، تحصیل جنڈ، ضلع اٹک) کی اولاد کو ان کی کتب اس معاہدے کے تحت واپس کر دی گئیں۔ کتب کی بہتر حفاظت کا یہ ایک بہترین طریقہ تھا جو خلفائے مولاناؒ نے اختیار کیا۔

حضرت مولانا غلام محی الدین احمدؒ [م۔۱۹۲۰ء] کے تین صاحبزادے تھے۔

۱۔ حضرت مولانا محمد احمد الدینؒ مکھڈی [م۔۱۹۶۹ء]

۲۔ حضرت مولانا محمد الدینؒ مکھڈی [م۔۱۹۷۵ء]

۳۔ حضرت مولانا غلام زین الدینؒ مکھڈی ثم ترگوی [م۔۱۹۷۸ء]

تینوں حضرات علم وفضل میں یگانۂ روزگار تھے۔ بعض احباب نے ۱۹۲۰ء کے بعد کتب خانہ مولاناؒ کے بارے میں لکھا کہ اسے باقاعدہ ان بھائیوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ چونکہ حضرت غلام محی الدین احمدؒ کے وصال (۱۹۲۰ء) کے وقت حضرت خواجہ محمود غریب نواز تونسویؒ، سجادہ نشین خانقاہ محمودیہ سلیمانیہ، تونسہ شریف (ڈیرہ غازیخان) مکھڈ شریف تشریف لائے تھے۔ آپؒ نے بھی کتب خانہ کی حفاظت اور اسے ایک ہی مقام پر رکھنے کی تاکید فرمائی تھی۔ کتب خانہ اپنی سابقہ عمارت متصل خانقاہ حضرت مولاناؒ میں ہی قائم رہا۔ الحمدللہ اب بھی وہیں موجود ہے۔ البتہ حضرت مولانا محمد الدینؒ اور حضرت مولانا زین الدینؒ نے اپنے ذوقِ مطالعہ

کے جو کتابیں کتب خانہ سے لیں۔ اُن میں سے کچھ کتابیں واپس نہ ہوئیں، اور نہ ہی واپسی کا تقاضا کیا گیا۔ پھر انھیں صاحبان نے اپنے ہاں نجی کتب خانوں کی بنیاد رکھی، جن میں یہ کتابیں اور کچھ دیگر کتب جو بعد ازاں ان صاحبان نے خود خرید فرمائیں تھیں، اِن نجی کتب خانوں میں جمع ہوئیں۔ اب ان نسخہ جات اور مطبوعہ کتب کو ان کتب خانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

کتب خانہ مولانا کی کتب الحمدللہ محفوظ ہیں۔ ان شاء اللہ جلد مخطوطات اور مطبوعات کی فہرست شائع کر دی جائے گی۔ اسکالر کے لیے کسی بھی کتب کی سی۔ ڈیز یا کتاب کا عکس مہیا کیا جاتا ہے۔ ''قندیل سلیماں'' کے نام سے ایک سہ ماہی کتابی سلسلہ اپنی ۱۰، اشاعتیں مکمل کر چکا ہے۔ کتب کا اضافہ بھی روز بہ روز ہو رہا ہے۔ کتب خانہ میں گوشۂ نظامؒ کے تحت سلسلہ چشتیہ نظامیہ وصابریہ کی کتب کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔ جبکہ گوشۂ نذر صابری میں اٹک کے اہل قلم کی کتب کو محفوظ کیا گیا ہے۔ گوشۂ ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، اور گوشۂ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد میں ان صاحبان کی طرف سے کتب خانہ مولانا کو عطیہ کیے گئے ذخیرۂ کتب کو جمع کیا گیا ہے جو علم کے متلاشیوں کے لیے راحت کا ساماں لیے ہوئے ہے۔

☆☆☆☆☆

حضرت علامہ حافظ محمد احسن المعروف حافظ دراز[۱۲۰۲ھ تا ۱۲۶۳ھ]

حافظ محمد بخش سیالوی ☆

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ (م۔۱۳۰۰ھ) کے احوال ومناقب میں یہ روایت بہ کثرت پائی جاتی ہے کہ آپ کے زمانۂ طالب علمی (قیامِ مکھڈ شریف) میں حضرت مولانا محمد علی مکھڈیؒ (م۔۱۲۵۳ھ) کے ایک معتقد تاجر میاں محمد امین نے اپنے تجارتی سفر کابل کے لیے ایک نیک سیرت طالب علم بہ طورِ خیر و برکت حضرت سے مانگا۔ آپ نے ہونہار طالب علم (خواجہ) شمس الدین سیالویؒ کو اُن کے ہمراہ کیا۔ قافلہ بخیر و عافیت کابل پہنچا، مگر بوجوہ قافلہ کو وہاں قیام کے لیے عرصہ چھ ماہ درکار تھا۔ جواں ہمت طالب علم (جسے علمی و روحانی افق پر شمسِ تاباں بن کر درخشاں ہونا تھا) سے فارغ نہ رہا گیا۔ آپ نے یکتائے زمانہ عالم حافظ درازؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور آپ سے حدیث شریف کی سند حاصل کی۔

ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ذیل میں ہم حافظ درازؒ کے احوال ومناقب جو تذکرہ علماو مشائخ سرحد (حصہ اول) از: فقیر محمد امیر شاہ قادری یکہ توت، پشاور سے لیے گئے ہیں، قارئین کے ذوق مطالعہ کی نذر کررہے ہیں۔ اس استدعا کے ساتھ کہ اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے صاحبان علم اس پر مزید دادِ تحقیق دے سکیں۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

☆ محمدی شریف، ضلع چنیوٹ

آپ کا اسمِ گرامی حافظ محمد احسنؒ والد کا نام حافظ محمد صدیق اور دادا کا نام محمد اشرف تھا۔ حافظ دراز کے نام سے مشہور تھے۔ ''استاذ العلماء'' لقب تھا۔ ''حدائق الحنفیہ'' کے مصنف مولوی فقیر محمد جہلمی لکھتے ہیں'' پشاور کے لوگ آپ کو حافظ دراز کے نام نامی سے ہی جانتے ہیں اور آپ کے اصلی نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ آپ کو دراز یعنی لمبا اس لیے کہا جاتا ہے کہ آپ کا قد غیر معمولی لمبا تھا۔ میرے استادِ محترم محدث صوبہ سرحد صاحبزادہ حافظ علی احمد جان نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے کہ ایک بار آپ جوتی بنوانے کے لیے تشریف لے گئے۔ موچی اپنے مکان کی چھت پر جوتی بنا رہا تھا۔ آپ نے اس کے کوٹھے پر اپنے سر کو اُٹھا کر فرمایا'' او جوتی والے مرے پاؤں کی جوتی ہوگی۔ اُس نے جواب میں کہا کہ مولانا گھوڑے سے نیچے اُتر کر اوپر آجایئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں تو اپنے پاؤں پر کھڑا ہوں۔ وہ یہ سُن کر گھبرا گیا کہ یہ اتنے لمبے قد کا آدمی کہاں سے آیا۔ وہ کوٹھا چھوڑ کر بھاگ گیا۔

حافظ درازؒ موضع خوشاب (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ مگر مستقل طور پر پشاور شہر کو اپنی قیام گاہ بنالیا تھا۔ آپ کا تمام خاندان علم و فضل اور قرآنِ مجید کے حفاظ کا گھرانہ تھا۔ یہاں تک کہ آپ کے گھرانے کی عورتیں بھی حافظِ قرآن اور زیورِ علم سے آراستہ تھیں۔

صاحبِ حدائق الحنفیہ لکھتے ہیں'' خاندانِ علم و فضل سے تھے'' صاحبِ تذکرہ علمائے ہند فرماتے ہیں۔ ''علمی خاندان کے فرد تھے۔'' آپ نے علوم متداولہ کا بیشتر حصہ اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کیا۔ مولوی فقیر محمد جہلمی لکھتے ہیں۔ ''اکثر علوم اپنی والدہ ماجدہ جو کہ ایک بڑی عالمہ فاضلہ تھیں سے حاصل کیے اور مسند افادت و اضافت پر متمکن ہو کر تمام عمر تدریس و تالیف میں صرف کی۔ چونکہ آپ ایک علمی گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے اپنے خاندان کے اس علم کے ورثہ کو پورا پورا حاصل کیا۔ اور'' استاذ العلماء'' کے معزز لقب سے پکارے گئے۔ آپ کا مکان اور مسجد باقاعدہ ایک دارلعلوم کی صورت اختیار کیے ہوئے تھا۔ جس میں پشاور، مضافاتِ علاقہ آزاد ، کابل، قندھار، غزنی، ہرات، ثمرقند اور بخارا تک کے طلبا علوم متداولہ حاصل کرتے اور فراغت

حاصل کر کے صاحبِ فتویٰ اور صاحبِ درس بن کر اپنے اپنے ممالک کو لوٹتے۔ اس تمام علاقے میں آپ کے تبحرِ علم کی شہرت تھی۔ مولوی غلام رسول مہرؒ اپنی کتاب ''اسماعیل شہدؒ'' میں لکھتے ہیں۔ ''مولانا محمد احسن المعروف حافظ دراز بن حافظ محمد صدیق'' پشاوری تبحرِ عالم، علومِ عقلیہ ونقلیہ کے ماہر سرحد سے ثمر قند تک ان کے علم کا چرچا تھا۔'' آپ پشاور کے علما میں چوٹی کے عالم اور مرکزی حیثیت کے مالک تھے۔ مذہبی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے اس وقت آپ مسلمانوں کی قیادت کرتے تھے۔ جس وقت پشاور کے علما کی طرف سے محدثین ہندوستان کی تحریک پر ان کے عقائد پر تنقید ہوئی تو مولوی اسماعیل دہلوی نے ان کے شکوک وشبہات کے جواب میں دو۔۲ خط لکھے۔ سب سے پہلے جس عالم کو اُنھوں نے مخاطب کیا وہ آپ ہی کی ذات تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس وقت کے علما میں بہت بلند وارفع مقام کے حامل تھے۔ آپ ایک ایسے دور میں فقہ، اصولِ فقہ، حدیث، اصولِ حدیث اور تفسیر کی اشاعت وترویج میں مصروف تھے۔ جس دور کو پُر فتن دور کہنا حقیقت پر مبنی ہے۔

دُرّانیوں کا زوال، افغانوں کی خانہ جنگی اور ایک دوسرے کو برباد کرنے کی ریشہ دوانیاں سکھوں کے ظالمانہ راج پر منتج ہوئی۔ یہ سکھوں کا دور ایک ایسا دور تھا جس میں ہر ظلم کا نام انصاف تھا۔ ہر شریف اور باعزت شہری کو بے عزت اور ذلیل کرنا ان کے نزدیک شریفانہ فعل تھا۔ مساجد اور خانقاہوں کو تباہ کر کے گھوڑوں اور خچروں کے اصطبلوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس قسم کی ابتلا اور آزمائشوں کے امتحان میں علم کی مشعل کو روشن رکھنا، تصنیف وتالیف میں مشغول رہنا، مجالسِ وعظ قائم کرنا آپ کی ہمت اور استقلال کا روشن ثبوت ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی کے نواسے جناب حضرت قطب برحق شاہ غلام محمد معصومی المعروف حضرت جیؒ پشاوری جب سرہند شریف سے ہجرت کر کے پشاور تشریف لائے تو حافظ درازؒ بسا اوقات آپ سے ملنے محلّہ فضلِ حق صاحبزادہ یکہ توت میں آیا کرتے۔ حضرت جیؒ علما وصلحا کے بڑے قدر دان تھے۔ دو بار ہفتہ میں لوگوں کی اصلاح کے لیے مجلس وعظ کا اہتمام فرماتے۔ چنانچہ ہفتہ میں ایک دن حافظ

دراز ؒ کے وعظ کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ صاحب تحفۃ المرشد فرماتے ہیں "بروزِ جمعہ حافظ دراز را کہ عالمِ متبحر بود نزد خود برائے وعظ طلب می کردند" یعنی جمعہ کے دن حضرت جیؒ حافظ دراز کو جو کہ متبحر عالم تھے اپنی مجلس میں وعظ کے لیے بلواتے۔ آپ کے مواعظ ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے عقائد حقہ اہلسنت والجماعت کی اشاعت پر مبنی ہوتے اور نہایت ہی مدلل اور موثر طریقہ پر وعظ فرماتے۔ آپ کا وعظ اتنا پُر درد ہوتا کہ سامعین ہمیشہ اشک بار رہتے۔ بڑی بڑی دور دراز جگہوں سے لوگ کشاں کشاں آپ کی محفل میں کھچے چلے آتے۔ ظہر کی نماز کے بعد عصر کی نماز تک وعظ کی مجلس جاری رہتی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپ کے حافظ دراز واعظ کے نام سے معروف ہونے کی۔

آپ اتنے نڈر اور بے خوف انسان تھے کہ حق کہنے میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ بزرگوں نے بتایا کہ ایک بار آپ نے اپنے وعظ میں وقت کے حاکم جرنیل ابی طویلہ اطالوی کو اس کے مظالم پر خوب بُرا کہا۔ اس نے گور گھٹڑی میں آپ کو طلب کیا۔ بس پھر کیا تھا پشاور شہر میں کہرام مچ گیا۔ مشائخ و علما مسجدوں اور خانقاہوں سے باہر نکل آئے۔ بجائے اس کے کہ ابی طویلہ آپ کو کچھ کہتا۔ یہ دیکھ کر آپ کو عزت واحترام سے رخصت کر دیا۔ آپ نے درس وتدریس کے ساتھ سلسلۂ تصنیف وتالیف بھی جاری رکھا۔ چنانچہ بخاری شریف کی شرح بنام "منح الباری شرح صحیح البخاری" فارسی میں لکھی۔ حضرت محدثِ جلیل مولانا مولوی میاں نصیر احمد المعروف میاں قصہ خوانی نے اس شرح کے پہلے پارہ کی تشریح کر کے چھپوائی۔ آپ کا قلمی نسخہ مہتمم دار العلوم ربیع الاسلام بھانہ ماڑی جناب مولانا فضل صمدانی کے پاس تھا جو کہ اب ان سے پشاور یونیورسٹی نے خرید لیا ہے اس شرح میں آپ نے اسماء الرجال کی پوری زندگی بیان کر دی ہے۔ احادیث کی تطبیق کی ہے۔ فقہ حنفی کو احادیثِ بخاری سے ثابت کیا ہے۔ ضروری ضروری نحوی ترکیبیں کی ہیں۔ لغاتِ حدیث کو حل کیا ہے اور عقائدِ حقہ اہلسنت والجماعت کو احادیثِ بخاری سے کھول کھول کر بیان فرمایا ہے۔ زبان انتہائی سلیس اور آسان ہے۔ غرض یہ کہ ہر علم کو یہ کتاب اپنے پہلو میں لیے ہوئے ہے۔ قاضی مبارک پر عربی میں ایک مبسوط حاشیہ لکھا۔ یہ حاشیہ اپنی جامعیت کی وجہ سے اتنا مقبول ہوا کہ

بطور درس پڑھایا جاتا ہے۔ تمہ اخوند یوسف پر حواشی لکھے۔ سورۃ یوسف اور سورۃ والضحیٰ سے لے کر آخری سورۃ تک کی تفاسیر لکھی۔ ''معراج نامہ'' اور ''وفات نامہ'' نامی رسالے لکھے۔ بادشاہ بخارا نے آپ سے چند نہایت اہم سوالات دریافت کیے۔ آپ نے ان تمام سوالات کے جوابات بالتفصیل دیئے جو کہ اسلامیہ کالج، پشاور کی لائبریری میں عددِ مسلسل ۷۹۶ میں محفوظ ہے۔ آپ نے بہت ہی قیمتی اور بیش بہا کتب خانہ چھوڑا تھا۔ شومئی قسمت سے برلب کٹھ اندرون قصہ خوانی بازار میں آپ کے مکان کے ساتھ آگ لگ گئی جس کی وجہ سے وہ آگ آناً فاناً آپ کے مکان تک پہنچ گئی۔ آپ کے نواسے مکان سے سامان تک نہ نکال سکے۔ تمام سامان بمعہ کتابوں کے جل کر خاکستر ہو گیا اور وہ بیش قیمت کتب خانہ بھی ضائع ہو گیا۔ آپ کا وصال ۶۱ سال کی عمر میں ۱۲۶۳ھ میں ہوا۔

☆☆☆☆☆

تذکرہ اساتذہ کرام درس گاہ حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی

حضرت علامہ قطب الدینؒ غورغشتی

علامہ حافظ محمد اسلم

حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈوی کہ آستانہ پاک میں منصبِ تدریس کے فرائض انجام دینے والوں میں سے استاذ الکل جامع المعقول والمنقول استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا قطب الدینؒ غورغشتی کا اسمِ گرامی بھی بہت نمایاں ہے۔

ولادت: حضرت مولانا قطب الدین ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء میں مولانا شہاب الدین کے ہاں غورغشتی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ گرامی بھی ایک جید عالم دین تھے۔ مشہور عالم مولانا نصیر الدین غورغشتی آپ کے سگے چچا تھے۔ چونکہ مولانا قطب الدین عمر میں مولانا نصیر الدین سے بڑے تھے۔ اس لیے علمی حلقوں میں قطب الدین صاحب کو بڑے استاد اور نصیر الدین کو چھوٹے استاد کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

تعلیم: مولانا موصوف نے ابتدائی کتابیں اپنے والدِ گرامی سے غورغشتی ہی میں پڑھی تھی۔ دیگر علوم وفنون میں آپ نے استاذ الکل ماہر علوم عقلیہ ونقلیہ حضرت مولانا شاہ سعید صاحب ساکن زروبی (ضلع مردان) سے اکتسابِ فیض فرمایا۔ عرصہ چار سال تک شاہ صاحب کے پاس ہی رہے۔ ایک اور روایت کے مطابق مولانا قطب الدین مولانا عبدالغفور ہزاروی کے جدِ امجد مولانا محمد عالم ہزاروی سے بھی کتب فقہ ومیراث کا استفادہ کرتے رہے۔ اس روایت کا اظہار اُس وقت ہوا جب مولانا عبدالغفور ہزاروی استاذ العلماء علامہ قطب الدین سے تعلیم حاصل کر کے جانے لگے تو مولانا قطب الدین نے فرمایا کہ آج میں نے اپنے استاذ محمد عالم ہزاروی کا کچھ حق ادا

☆ صدر مدرس درس نظامی، خانقاہِ معلّٰی حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی، مکھڈ شریف [اٹک]

کر دیا ہے۔ تاہم حدیث شریف کے لیے آپ نے دارالعلوم دیو بند میں مولوی رشید احمد گنگوہی سے استفادہ کیا۔ علمائے دیو بند کے مشہور عالم مولوی محمود الحسن درسِ حدیث میں آپ کے ہم سبق تھے۔

تدریس: جب مولانا قطب الدین حصولِ تعلیم سے فراغت پا چکے تو آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا۔ سب سے پہلے آپ ریاست ہندوستان علی گڑھ میں مدرسِ اعلیٰ کی مسند پر جلوہ گر ہوئے۔ جہاں آپ نے کتبِ معقول شرح مطالع مع ملا حسن حمد اللہ وغیرہ کی اس انداز میں تدریس فرمائی کہ وہاں آپ جامع المعقول کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم معقول پڑھانے میں ایک خاص وصف اور ملکہ عطا فرمایا تھا۔ جس کی بدولت اپنے وقت کے جید علما وفضلا آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہونے میں فخر محسوس کرتے۔ جیسا کہ فاضلِ اجل حضرت مولانا عبدالسلام قندھاری نے کافی عرصہ آپ سے فراغتِ تعلیم کے بعد آپ کی خدمت میں گزارا۔ مولانا عبدالسلام وہ شخصیت ہیں جنھوں نے منطق کی مشکل ترین کتاب حمد اللہ پر حاشیہ تحریر فرمایا تھا۔ جو ۱۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایک مرتبہ مولانا قطب الدین "صدرا" پڑھا رہے تھے تو ایک مشکل مقام پر رُک گئے؛ دراصل حاشیہ اور متن کی عبارت میں تضاد تھا۔ مولانا قطب الدین نے اپنے شاگردوں کو فرمایا کہ اس مشکل مقام کو مولانا عبدالسلام سے حل کروا کر لاؤ۔ مولانا نے چند لحات میں وہ مقام حل فرما دیا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ استاد صاحب سے عرض کرنا کہ حاشیہ کی عبارت ٹھیک نہیں ہے۔ بعد ازیں کسی نے مولانا عبدالسلام سے کہا کہ جب آپ اس قدر جید فاضل ہیں تو یہاں آپ کیا کر رہے ہیں۔ یعنی کسی جگہ درس و تدریس کیوں نہیں فرماتے، تو مولانا نے بڑا خوبصورت جواب دیا کہ یہ [مولانا قطب الدین] میرے استاد ہیں۔ مجھے ان سے اس قدر محبت ہے کہ میں ان کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا؛ اور ان کا ایک خصوصی وصف اور کمال بھی ہے جو دیگر علما میں نہیں ہوتا۔ وہ کمال یہ ہے کہ کسی بگڑی ہوئی بات کی خوبصورت انداز میں توجیح کر دینا۔ یہ وصف مجھے دیگر علما میں نظر نہیں آتا؛ اور اسی خوبی نے مجھے یہاں قید کر رکھا ہے۔ بہر صورت کچھ عرصہ آپ مشہور عالمِ دین محدث کبیر مولانا سیف الرحمان کابلی کی دعوت پر مدرسہ فتح پور، دہلی

میں بھی تدریس کے لیے تشریف لے گئے۔ جب مولانا سیف الرحمان صاحب بیمار ہو گئے تو احادیث شریف پڑھانے کی ذمہ داری بھی آپ پر ڈال دی گئی۔ آپ بہت جلد حدیث شریف پڑھانے میں بھی باکمال محدث مشہور ہو گئے۔ جب آپ تحقیق مذاہب، تطبیق روایات اور مذہب حنفیہ کی وجوہ ترجیح کو فاضلانہ انداز میں بیان فرماتے تو سامعین بھی انگشت بدنداں رہ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فنِ مناظر پر بھی بڑی مہارت سے نوازا تھا۔ آپ نے کئی بار مولوی حسین علی واں بھچروی کو مناظرہ میں شکست دی؛ بلکہ متعدد مقامات میں بدمذہب آپ کا نام سن کر ہی لاجواب ہو جاتے۔

آمدِ مکھڈ: مولانا غلام محی الدین مریدِ خاص مولانا احمد الدین مکھڈی فرماتے ہیں جب مولانا قطب الدین غورغشتی چکوال کسی مدرسہ میں پڑھاتے تھے تو آستانہ عالیہ مکھڈ شریف کے سجادہ نشین امام المتوکلین پیر غلام محی الدین احمدؒ [م۔۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء] کو آستانہ پاک پر ایک جید مدرس کی ضرورت تھی۔ جب مولانا قطب الدین صاحب سے رابطہ کیا گیا تو وہ آمادہ ہو گئے۔ آپ کافی عرصہ خانقاہِ معلی حضرت مولانا شاہ محمد علیؒ مکھڈی کی درس گاہ میں دیگر طلبا کے علاوہ خصوصاً حضرت مولانا محمد الدینؒ مکھڈی [م۔۱۹۷۵ء] کو پڑھاتے رہے۔ جب آپ نے مکھڈ شریف سے اپنے گاؤں غورغشتی میں اپنے مدرسے کی بنیاد ڈالی تو آپ کبھی کبھار حضرت مولانا محمد علیؒ مکھڈی کی قبرِ انور شریف کی زیارت کے لیے حاضر ہوتے رہتے۔ مولوی غلام محی الدین صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں نے مولانا قطب الدینؒ کی زیارت کی تو اُس وقت آپ کی عمر ۱۰۰ سال کے قریب تھی۔ اِس ضعف اور کمزوری کے باوجود بھی آپ مکھڈ شریف ہر سال حاضری دیا کرتے تھے۔ آپ نے تاحیات فی سبیل اللہ خوب خدمتِ خلق کا فریضہ سرانجام دیا۔ آخری دم تک آپ نے اپنے آپ کو تدریسی مشاغل میں مصروف رکھا۔

آپ کے ایک شاگرد مولانا عبدالحلیم بیان کرتے ہیں کہ حضرت استاد صاحب نمازِ فجر سے ظہر تک مسجد میں درس و تدریس فرمایا کرتے اور نمازِ ظہر کے بعد اپنی زمین کی دیکھ بھال کے

لیے تشریف لے جاتے تھے۔

جلال وکردار: حضرت مولانا قطب الدین انتہائی پُر وقار، بارُعب شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کی موجودگی میں کسی کو فضول گفتگو کرنے کی جرأت تک نہیں ہوتی تھی۔ آپ جب تدریس سے فارغ ہوتے تو گھر جاتے ہوئے راستے میں ہر شخص بصد ادب واحترام دست بستہ کھڑا ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی جلالتِ علمیہ سے نوازا تھا کہ جب دورانِ سبق آپ کے پاس کوئی ملاقات کی خاطر حاضر ہوتا تو آپ دورانِ سبق کسی سے ملاقات نہ فرماتے۔ ایک مرتبہ ڈپٹی کمشنر آپ کے پاس ملاقات کے لیے حاضر ہوا؛ تو آپ نے فرمایا: میں اس وقت طلبا کو سبق پڑھا رہا ہوں۔ لہٰذا ڈپٹی کو کہو کہ فارغ وقت میں ملاقات کے لیے آئے؛ علاوہ ازیں اللہ نے آپ کو یہ خوبی بھی عطا فرمائی تھی کہ آپ اپنے خاندانی مقدمات اور علاقائی فیصلہ جات میں ایک حاکم تسلیم کیے جاتے تھے۔ آپ کا فیصلہ حتمی فیصلہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص پر شاتمِ رسول ہونے کا الزام تھا۔ حکومتِ وقت نے مختلف علما کرام سے فتویٰ طلب کیا کہ اس شخص نے توبہ کرلی ہے۔ جب کہ اکثر علما کی رائے یہ تھی کہ شاتم رسول کی توبہ کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں اور بعض علما کا خیال تھا کہ توبہ قابلِ قبول ہے۔ بہرصورت مسئلہ مذکور نے سنگین صورت اختیار کرلی حتیٰ کہ فریقین کے مابین مناظرہ طے ہوگیا۔ ثالثی فیصلے کے لیے استاذ العلما مولانا قطب الدین کو بلایا گیا۔ آپ نے خداداد بصیرت سے اس مقدمہ کا ایسا فیصلہ فرمایا کہ جس پر ہر عام وخاص راضی ہوگیا؛ اور ہر دو فریق پر آپ کا علمی رعب اس قدر غالب آگیا کہ کسی نے آپ کے فیصلے سے رُوگردانی نہیں کی اور جب تک آپ زندہ رہے تو کسی گستاخ و بے ادب کو سر اٹھانے کی جرأت بھی نہیں ہوئی۔ اسی طرح آپ کے شاگرد مولانا عبدالحلیم بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ گرمی کے موسم میں نہایت سخت بارش برسنے لگی۔ جس کی وجہ سے آپ اپنے سابقہ معمول کے مطابق بعد از ظہر اپنی زمین کی طرف نہیں جا سکے۔ جب بارش تھم گئی تو ایک آدمی آپ کے پاس مسجد میں آیا اور عرض کرنے لگا کہ استاد جی فلاں شخص نے بارانی پانی کا رُخ آپ کے کھیت کی طرف موڑ دیا ہے۔ جس کی وجہ سے آپ کی فصل زیر آب آکر تباہ ہوگئی ہے۔ جب استاد صاحب زمین کو دیکھنے کے لیے تشرف لے گئے تو واقعتاً فصل تباہ ہو چکی تھی۔ آپ نے بعد از عصر اس آدمی کو بلوایا۔ جب وہ شخص مسجد کے قریب آیا اور جوتے اتارنے لگا تو اچانک کھانسی کا شدید دورا پڑا۔ زمین کا سہارا لیتے ہوئے نیچے بیٹھ گیا۔ کسی نے اس سے درد کی وجہ دریافت کی تو وہ کہنے لگا کہ میں استاد صاحب کا مجرم ہوں؛ آپ کے

رعب وجلال کی ہیبت کو برداشت نہیں کر سکا۔ جس کی وجہ سے میری یہ حالت ہوگئی ہے۔ دیکھیے اللہ والوں سے دشمنی اور عداوت کرنے والوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ نفوسِ قدسیہ کے خداداد رعب کو برداشت نہیں کر سکتے۔

وصال: حضرت مولانا نے تمام زندگی خدمتِ دین ہی میں صَرف فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک سو دس۔۱۱۰ برس کی طویل عمر عطا فرمائی؛ جس کی بدولت آپ نے میدانِ تدریس کو خوب رونق بخشی۔ بالآخر ۶۔صفر ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں رشدوہدایت کا آفتاب اور علم وعرفان کا مہتاب غورغشتی کے اُفق پر غروب ہوگیا۔ آپ کی آخری آرام گاہ قبرستان غورغشتی میں واقع ہے۔ آپ نے تدریس کے فیوض و برکات سے بے شمار مخلوقِ خدا کی خدمت کی۔ جن کے اسمائے گرامی احاطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ چند مشہور حضرات کے اسما درج ذیل ہیں۔

۱۔ قاضی عبدالسبحان کھلابٹ: قاضی صاحب اپنے وقت کے بے مثال مناظر، مدرس، مصنف گزرے ہیں۔ آپ نے بہت سی کتب پر تعلیقات وغیرہ تحریر فرمائی ہیں۔

۲۔ حضرت مولانا محمد الدینؒ مکھڈی: آپؒ نے مولانا قطب الدینؒ سے علم معقول کی منتہی کتب پڑھیں۔

۳۔ مناظر اہلسنت علامہ عبدالغفور ہزارویؒ ۴۔ مولانا عبدالسلام قندھاروی

۵۔ مولانا عبدالحلیم ذروبوی ۶۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق

۷۔ نصیرالدین غورغشتی

ماخذ

۱۔ تذکرہ علمائے چھچھ، نذیر رانجھا، ناشر محمد ریاض دُرانی، ۲۰۰۷ء

۲۔ فیوضاتِ سبحانیہ، قاضی غلام محمود ہزاروی، مکتبہ غوثیہ مہریہ، جہلم، ۱۳۸۷ھ

۳۔ تذکرہ عارفِ ربانی، محمد آصف ہزاروی

☆☆☆☆☆

انوار الکریمین

پروفیسر محمد انور بابر☆

یارب تو کریمی و رسول تو کریم
صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم

راہِ عقیدت کے راہرو مخدومِ امم سلطان العارفین حضرت سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش لاہوریؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز جناب سرورِ کونین حضور ﷺ فقر کے بارے میں کچھ فرمارہے تھے۔ کہ فقیر کو معرفتِ الٰہی کیونکر حاصل ہوتی ہے۔ اس پر صحابہ کبارؓ نے عرض کیا یارسول اللہ، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ اتنے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام جنابِ باری تعالیٰ سے یہ حکم لائے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ.

ترجمہ: تو کیا انھوں نے زمین میں سفر نہ کیا کہ دیکھتے ان سے اگلوں کا کیسا انجام ہوا۔

(سورۃ محمد۔ پارہ ۲۶۔ آیت ۱۰)

پس اے ہجویری! سیر و سیاحت اور سفر کی دولت کہ المنتہا ہے۔ اسے اختیار کر اور اس وقت راہ لے، دلیلوں اور حجتوں کو چھوڑ۔ اگر تجھے سامانِ سفر کی قدرت ہے تو حج کا راستہ لے۔ محنت و مشقت برداشت کر، تاکہ تو میدانِ حقیقت میں آجائے۔ میں نے بھی اسی دن سے رُوئے زمین کی سیر و سیاحت اختیار کی اور عجائباتِ خلق مشاہدہ کیے۔ [کشف الاسرار]

انسان کو زندگی میں مختلف مواقع پر بے شمار سفر درپیش ہوتے ہیں۔ سیر و تفریح کے علاوہ ٹیسٹ، انٹرویو، ملازمت، کاروبار اور تجارت کی غرض سے انسان مسافر بنتا ہے۔ اور عملی تجربہ حاصل کرتا ہے۔ مشاہدہ سے اس کے علم اور معلوماتِ عامہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ ویسے تو یہ دنیا

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر (ر)، پوسٹ گریجویٹ کالج، لکی مروت

سرائے ہے اور اس میں پیدائش کے دروازے سے آنے والے مسافر ہیں اور انھیں آخرت کا لمبا سفر درپیش ہے اور آخر موت کے دروازے سے پھر وہیں واپسی ہے جہاں سے آئے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سفر طویل ہے کچھ زادِ راہ لے جاؤ
کسی فقیر کی کامل نگاہ لے جاؤ

لیکن دنیا کے رسمی وروایتی اسفار میں ایک سفر ایسا ہے جس کی ہر مؤمن کے دل میں تمنا انگڑائی لیتی رہتی ہے۔ لیکن یہ ایک والہانہ جذبہ ہے جسے تصوف میں وجدان کہتے ہیں۔ وجدان وحی والہام اور کشف والقا کا ذریعہ ہے۔ دراصل یہ عقل ہی کی ایک اعلیٰ اور ارتقا یافتہ صورت ہے۔ جو مسلمان تو مسلمان بلکہ کبھی کبھار غیر مسلم کے دل میں بھی پتہ نہیں کہاں سے یہ پاکیزہ خواہش عود کر آتی ہے۔ بطورِ تمثیل ایک ہندو شاعر وشنو کمار شوق لکھنوی کے نعتیہ اشعار میں اس وجدانی کیفیت کا اظہار ملاحظہ کیجیے۔

لڑاتا ہے نظر سورج سے ہر ذرّہ مدینے کا
رسول اللہ سے اتنا بڑھا رتبہ مدینے کا
جو محبوبِ خدا ہے کیف اُس کا کارفرما ہے
انوکھا کیوں نہ ہو عالم سے میخانہ مدینے کا
جہاں کا گوشہ گوشہ نورِ حق سے ہو گیا روشن
دکھاتا ہے کچھ ایسے جلوے آئینہ مدینے کا
نہیں پوشیدہ ہے اُس سے کوئی بھی راز قدرت کا
بہت ہشیار ہے عالم میں دیوانہ مدینے کا
اگر جاں بھی نکل جائے مری طیبہ کی راہوں میں
تو سمجھوں گا بہت سستا ہوا سودا مدینے کا

ابھی تو خواب ہی دیکھا ہے اب تعبیر دیکھوں گا
نگاہوں میں لیے پھرتا ہوں میں نقشہ مدینے کا
بس اب تو شوق دل میں بس یہی ارمان باقی ہے
کسی صورت پہنچ کر دیکھ لوں روضہ مدینے کا

بارگاہِ رسالت پناہ ﷺ میں حضوری کے لیے وجدان کافی نہیں اس کے لیے ایمان بھی ضروری ہے۔ آخر ایمان کیا ہے؟ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

قرآن جسے ایمان کہتا ہے وہ دراصل کائنات کو حیاتی طریقے سے سمجھنے کا نام ہے۔ محض عقائد کو بے جان طور پر مان لینا ایمان نہیں۔ ایمان تو ایک نادر تجربے کی بدولت حاصل ہونے والا زندہ یقین ہے۔ اس تجربے تک صرف مضبوط شخصیات ہی پہنچ سکتی ہیں؛ اور راضی بہ رضا ہونے کے اس اعلیٰ درجہ کو حاصل کرتی ہیں۔

ایمان کی تکمیل حضور سرورِ عالم ﷺ کی محبت سے مشروط ہے۔ جیسے کہ ارشاد فرمایا "لا حبلہ لا ایمان لہٗ" جسے محبت نہیں اُس کا ایمان ہی نہیں۔ حب رسول ﷺ کی دولتِ نایاب اُسے ملتی ہے جس کے عقیدے میں حیات النبی ﷺ کی حرارت و کیفیت ہو۔

ختم المرسلین ﷺ کی حیاتِ جاوید کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ان کا نام اقدس لو تو پگھل جاؤ۔ انھیں تصور میں لانا چاہو تو آنسو بن کر بہنے لگو اور جاں نثار کرنے کا سوچو تو بیٹھے بیٹھے مر جاؤ۔"

زہے نصیب! مجھ ایسے ناکارہ ہیچمدان کو بھی راہِ عقیدت کے اس مبارک سفر کا موقع حق تعالیٰ نے اپنے محبوب حبیب رسول اعظم کے طفیل عنایت فرمایا۔ اس عنایت پر ربِّ محمد عربی ﷺ کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ممنون اور شکر گزار ہوں۔ اس تمنا کے ساتھ کہ

ع　　　خدایا ایں کرم بارِ دگر کن

حرمین شریفین سے واپسی کے بعد ارادہ ہوا کہ کیوں نہ حج مبارک کے ان یادگار مقدس

ایام کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ تاکہ حرمین شریفین میں حاضری اور حضوری کی تڑپ رکھنے والے اس کے مطالعہ سے قرار پائیں اور مجھ گناہگار کی اس حاضری کی بھی تجدید ہو جائے۔

سکوں ملے گا تبھی جب مدینے جاؤں گا
سوال یہ ہے کہ میں کب مدینے جاؤں گا

مفکرِ اسلام حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

''سفر وسیلۂ ظفر صحیح معنوں میں اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ مسافر اپنے سفر میں دوسروں کو بھی شریکِ سفر کرے اور یہ یوں ممکن ہے کہ سفر نامہ میں لکھنے والا اپنے تمام تجربات و مشاہدات کو اس طرح بیان کرے کہ سفر نامہ پڑھنے والا ذہنی طور پر انھی راستوں اور گزرگاہوں پر گام فرسا نظر آئے جس سے سفر نامے کا مصنف گزرا ہے۔''

سفر نامہ علم و ادب کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے یہ واحد صنفِ ادب ہے جس کا تقریباً تمام اہم معاشرتی علوم سے گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام چھوٹی، بڑی زبانوں کے ادبیات میں سفر ناموں کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ لیکن سفر ناموں کی دنیا میں ''حرمین شریفین'' کے سفر ناموں کو کلیدی حیثیت حاصل ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس میں لکھنے والا روایتی رُوداد جو دماغی فکر و تخیل کا نتیجہ ہوتی ہے بیان نہیں کرتا بلکہ مصنف کے دل کے سوز و گداز کا لُہو بھی ان میں شامل ہوتا ہے: اور اسی سے نقشِ ناتمام کی تکمیل ہوتی ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
عشق ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

حجازِ مقدس کے اتنے سفر نامے لکھے جا چکے ہیں کہ اگر صرف ان کی فہرست مرتب کی جائے تو پوری کتاب بن جائے۔ مسلمان تو مسلمان بعض غیر مسلم بھی مسلمان کے لبادے میں سرزمینِ مقدس میں اس لیے گئے کہ وہاں کی کیفیات کا مشاہدہ کر سکیں۔

۱۸۷۸ء میں ایک عیسائی جان ایف کین نے محمد امین کے نام سے حج میں شرکت کی تھی

اور اپنے تاثرات قلمبند کیے تھے۔ اگر چہ کسی غیر مسلم کو حرمین کے حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ ارشاد ربانی ہے۔

یٰا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَس" فَلَا یَقْرَبُوْا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِھِمْ ھٰذَا.

ترجمہ: اے ایمان والو! مشرکین تو سراپا نجاست ہیں سو، وہ اپنے اس سال کے بعد (یعنی فتح مکہ کے بعد ۹ھ سے مسجدِ حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔

(آیت ۲۸، سورۃ التوبہ، پارہ ۱۰)

اس کے باوجود چند ایک عیسائیوں نے تحقیق کی غرض سے زائر کا بھیس بدل کر حج میں شرکت کی تھی۔ حاجی محمد امین بھی ان عیسائیوں میں سے ایک ہیں۔ میدان عرفات کے متعلق ان کی زبانی ان کے یہ تاثرات ملاحظہ فرمائیے۔

''عرفات ایک میدان ہے جو چار پانچ مربع میل رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ عرفات کے شمال مشرق میں دو سو گز اونچا پہاڑ ہے۔ جسے جبل العرفات کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ملحقہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جو جبل الرحمت کے نام سے موسوم ہے۔ جبل عرفات کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو جاؤ تو میدان عرفات یوں دکھائی دیتا ہے۔ جیسے ایک عظیم ایمفی تھیٹر ہو اور ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے لاکھوں آدمیوں کے ساتھ آپ ایک قدیم عظیم اور عالی شان سٹیج پر کھڑے ہیں''

[لبیک۔ صفحہ ۱۲۷ تا ۱۲۸]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ سفرناموں کی اس بھیڑ میں آخر کیا ضرورت تھی ایک اور سفرنامہ ''انوار الکریمین'' کا بھی اضافہ ہو جائے۔ آیئے! اس سوال کے جواب کے لیے تاریخ کا ایک ورق اُلٹتے ہیں۔

کمر خمیدہ، سانس پھولا ہوا ہاتھ میں سُوت کی اَٹی لیے یہ بڑھیا کہاں جارہی ہے؟ اسی سے پوچھ لیجئے۔ ''بازارِ مصر جارہی ہوں۔ جہاں یوسف نیلام ہو رہا ہے۔'' اس کے پاس دولت

نہیں، اس کے پاس کُل سرمایہ سُوت کی ایک اَٹی ہے۔ تو کیا امّاں! تُو اس اَٹی سے یوسف کو خریدے گی؟ نہیں بیٹا! میں تو صرف چاہتی ہوں کہ یوسف کے خریداروں میں میرا بھی نام لکھا جائے۔ امّاں! تمھیں مبارک ہو۔ تمہارا نام تاریخ کے ورق پر یوسف کے خریداروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لکھ دیا جاتا ہے۔"

قارئینِ کرام! ادبیاتِ عالیہ میں لفظ و معانی کی تنگ دامانی کا مجھے احساس ہے؛ اور صنفِ سفرنامہ میں لکھنے کا نہ کوئی سلیقہ جانتا ہوں اور نہ اتنے سفرناموں میں میرے سفرنامہ کی کوئی ضروت ہے۔ بس صرف خریدارانِ یوسف کی فہرست میں اپنا نام شامل کرنا مقصود ہے۔

اللہ تعالٰی اپنے پیارے حبیب حضور سرورِ کونین ﷺ اور آپ کی آل اور اصحاب رضوان اللہ علیھم اجمعین کے طفیل میری اس ادھوری، بے مایہ کوشش کو قبول فرمائے؛ اور اسے میری اور اس سفرنامے مبارک کو پڑھنے والوں کی نجات، بخشش اور کامیابی کا ذریعہ بنائے۔

[جاری ہے]

☆☆☆☆☆

حاضریٔ رسول ﷺ

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر☆

مسجدِ نبوی میں

مسجدِ نبوی ﷺ میں داخل ہوتے ہی قلب ونگاہ کی حالت بدل گئی۔ روضۂ اطہر پر نظر پڑی تو مدتوں کی مشتاق آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ دل پر ہیبت طاری ہوگئی۔ دُرود و سلام پڑھتے ہم مسجد کے اندر داخل ہوئے تو حُسنِ اتفاق سے مجھے ریاض الجنۃ کے ایک گوشے میں جگہ مل گئی۔ نماز پڑھی اور روضۂ اطہر کے سامنے حاضر ہوگئے۔ میرا دل جلالتِ نبوت کی تاب نہ لاسکا۔ قلب وجسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ روح، الحاح وزاری اور دل آہ وفغان کرنے لگا۔ سلام پڑھتے ہوئے میں بے ساختہ اُونچی آواز میں رونے لگا۔ وہاں قریب قریب سب حاضرین ہی آہ وزاری کررہے تھے۔ کسی کو کسی کا دھیان نہ تھا۔ جذب ومستی کی ایک کیفیت تھی جو قریب قریب سب اہلِ جذب وشوق پر طاری تھی میری ہچکی بندھ چکی تھی اور میں زور زور سے رورہا تھا۔ سلام پڑھنے کے بعد میں نے پہلے حضرت ابوبکر صدیق اور پھر حضرت عُمر فاروق رضی اللہ عنہما کے مزاروں پر حاضری دی اور سلام پڑھا۔

میں روضۂ مبارک کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ جالیوں کے سوراخوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا تو غلافِ مزار کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ یہ میرے پیارے نبی اور مسیحا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا روضۂ اطہر تھا۔ دل نے چاہا کہ اس سے لپٹ جاؤں، جی بھر کر روؤں اور فریاد کروں؛ لیکن یہ پیغمبرِ اعظم وآخر اور سیّد المرسلین ﷺ کا روضۂ مُبارک تھا۔ یہاں ادب واحترام شرطِ اوّلین تھی۔ فرطِ عقیدت ومحبت میں شرک کے ارتکاب کا بھی خطرہ تھا۔ شرک نہ خُدا، اور نہ محبوبِ خُدا کو منظور ہے۔ دل وفورِ جذباتِ محبت وعقیدت سے اپنے ہادی ومسیحا کی قدم بوسی کے لیے سجدہ

☆ سابق وائس چانسلر، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

ہوتا رہا۔ جب ہم سر بسجود ہوئے تو فردوسی خوشبو نے پھر مشامِ جان کو معطر اور روح کو مسحور کر دیا۔ موجۂ خوشبو میں وجد آفرین وسحر انگیز تاثیرِ حسن تھی۔ دوسری بار پھر اسی خوشبو نے مشامِ جاں کا استقبال کیا۔

ایک حیرت انگیز منظر

نماز کے اختتام پر جب بائیں جانب سلام کے لیے منہ پھیرا اور میری نظر روضۂ اطہر پر پڑی تو اس میں ملکوتی روشنی اور غیر مرئی ہستیوں کی پرچھائیاں سی دکھائی دیں۔ یہ بڑا ہی حیرت انگیز منظر تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، لیکن واقعیت کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ نماز اختتام پذیر ہوئی تو میں نے اپنے دائیں بائیں دو پُراسرار بزرگوں کو دیکھا جو بہت معمر دکھائی دینے کے باوجود تندرست وتوانا نظر آ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں روشن اور چہرے نورانی تھے۔ انھوں نے باری باری مجھ سے مصافحہ کیا۔ آنکھوں نے آپس میں کچھ کہا اور دل کو مسرت وعقیدت کا ایک عجیب سا احساس ہوا۔ وہ بزرگ جو بھی تھے، یقیناً اہلِ حُسن وسُرور میں سے تھے۔ جب تک ہم مدینۂ منورہ میں رہے، مجھے حرمِ نبوی میں ایسے ہی پُراسرار بزرگوں کی ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا۔

اصحابِ صُفّہ کا چبوترہ یا اِسلام کی پہلی یونیورسٹی

آج جمعۃ المبارک کا روزِ سعید تھا۔ ہم وقت سے بہت پہلے حرمِ نبوی میں پہنچے؛ لیکن مجھے ریاض الجنۃ میں جگہ نہ مل سکی۔ معلوم ہوا کہ اہلِ جذب وشوق صبح ہی سے وہاں بیٹھے یادِ الٰہی اور دُرود وسلام میں مشغول ہیں۔ بڑی مشکل سے اصحابِ صفہ کے چبوترے پر جگہ ملی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں اصحابِ صفہ علم وحکمت حاصل کرتے تھے۔ یہ گویا اسلام کی پہلی یونیورسٹی تھی، جہاں سے علم وحکمت کا آفتاب طلوع ہوا؛ اور اس نے ایک عالم کو روشن کر دیا تھا۔ یہ اسلام کے اولین طالب علموں اور علماء کے درس وتدریس کا متبرک مقام تھا۔ یہ علم وحکمت کے سرچشمے کا مقام تھا۔ اس احساس سے کہ مجھے یہاں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے، رُوح پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کاش میں بھی اصحابِ صفہ میں سے ہوتا! کاش مجھے بھی معلم

کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ مجھے پھر اس نظارے کو دیکھنے کی طلب و آرزو تھی۔ میں دُعا مانگتا رہا اور روضۂ اطہر کو ٹکٹکی لگائے تکتا رہا، لیکن ایک بار دیکھا دوسری بار دیکھنے کی حسرت ہی رہی۔

دل جلالتِ پیغمبری کا حریف نہ ہو سکا

مغرب کا وقت ہوتے ہی مسجدِ نبوی بقعۂ نور بن گئی اور اہلِ جذب و شوق سے کھچا کھچ بھر گئی۔ ہر اہلِ شوق کی کوشش یہ تھی کہ اسے ریاض الجنتہ میں جگہ ملے اور وہ ثواب بے حساب حاصل کرے، لہٰذا وہاں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ مغفرت و رحمت کے طلب گار نمازِ مغرب کے انتظار میں تھے۔ عُشاق مسلسل روضۂ اطہر پر حاضری دے رہے تھے۔ میں نے بھی کئی بار حاضری دینے کی کوشش کی مگر دل اس قدر جلالِ نبوی سے مرعوب تھا کہ اسے ایسا کرنے کی جسارت نہ ہوئی۔ روضۂ اطہر اس قدر جلالت مآب ہے کہ یہاں قلب و رُوح پر خوف طاری رہتا ہے۔ محبت اور خوف لازم و ملزوم ہیں۔

پہلے مغرب پھر عشاء کی نماز با جماعت پڑھنے سے وہ کیف وسُرور حاصل ہوا جو حرم کعبہ میں نماز پڑھنے کے سوا کہیں نصیب نہیں ہوا تھا۔ حرم کعبہ میں صرف اِلہٰ و رب تھا، لیکن مسجد نبوی میں الہٰ کے ساتھ اس کے حبیب بھی تھے۔ یہاں شرابِ محبت دو آتشہ تھی، اور اس کا کیف وسُرور بھی دُگنا تھا۔ یہاں حُسنِ الٰہی کے ساتھ حُسنِ رسالت مآب کے جلوے بھی تھے۔ یہاں خدا کا گھر بھی تھا جو جنتِ نگاہ تھا اور اس کے حبیب کا گھر بھی تھا جو فردوسِ نظر تھا۔ نگاہیں دونوں پر فدا ہو رہی تھیں اور دل دونوں کی محبت میں آہ و فغاں کر رہا تھا۔

اندھیرے میں روشنی

روضۂ اطہر کے اندر روشنی کا کوئی انتظام نہیں۔ کیوں؟ کئی زائرین نے مجھ سے شکایتاً یہ سوال پُوچھا۔ میرے پاس اس کا کوئی معقول جواب نہ تھا۔ شاید اس میں کوئی مصلحت ہو، جسے اربابِ حل و عقد ہی جانتے ہوں۔ ایک دن میں مشہور و مقدس اصحابِ صفہ کے چبوترے پر بیٹھا روضۂ اطہر کے اندر ٹکٹکی لگائے جھانک رہا تھا کہ اچانک ایسا دکھائی دیا۔ جیسے اندر ایک عجیب قسم کی

نظرافروز و رُوح پرور روشنی ہے۔ یہ روشنی کس کی تھی؟ دل سے کسی نے کہا: یہ روشنی اس پیکرِ حسن و نور کی ہے؛ جن کا یہ روضہ اطہر ہے۔ روضہ اطہر کو مصنوعی روشنی کی حاجت نہیں۔ کیونکہ یہ تو باغ فردوس کا ایک قطعہ ہے، جس میں آپ اپنے دوستوں کے ساتھ حُسن وسُرور کی ابدی زندگی گزار رہے ہیں۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ ان اہلِ جنت کی روشنی ہی سے یہ روضۂ جنت روشن رہتا ہے، لیکن عام نظریں اِس روشنی کا نظارہ نہیں کر سکتیں۔ نمازِ عشاء کے بعد ہم ہوٹل لوٹ آئے چونکہ میں رات کا کھانا نہیں کھایا کرتا، اس لیے بیگم نے تنہا کھانا کھایا، اور ہم سونے کی تیاری کرنے لگے۔

میرے پلنگ کے ساتھ کھڑکی تھی، جو ابھی تک بند تھی۔ ہم نے اُسے کھولا تو فرطِ حیرت و مسرت سے ہماری آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ ہمارے سامنے ہمارا منظورِ نظر گنبدِ خضراء تھا اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے سبز رنگ کے اور بھی گنبد تھے۔ سب رات کی تاریکی میں روشن اور جگمگ کر رہے تھے۔ ہم بہت دیر تک اس نورانی و نظرافروز نظارے سے کیف و سرور حاصل کرتے رہے۔ صبح تہجد کے لیے اُٹھنا تھا اور پھر سفر کی تکان بھی تھی، لہٰذا نیند سے مغلوب ہو گئے۔

حرمِ نبوی میں پہلی نمازِ تہجد

صبح دو بجے فون کی گھنٹی بجی اور ساتھ ہی آواز آئی کہ جنابِ عالی، تہجد کی اذان ہو رہی ہے۔ ہم نے جلدی سے وضو کیا اور چند لمحوں بعد حرم پاک میں حاضر تھے۔

اہلِ جذب و شوق کی یہ آرزو اور کوشش ہوتی ہے کہ وہ ریاض الجنتہ میں جگہ حاصل کر سکیں۔ وجہ یہ ہے کہ ارشادِ نبوی کے مطابق وہ اس حصے کو قطعہ جنت سمجھتے ہیں۔ جہاں نماز پڑھنے اور عبادت کرنے کا اجر بے حساب ملتا ہے۔ وہاں سجدہ کرنے سے ایک خاص قسم کی کیفیتِ جذب و مستی طاری ہو جاتی ہے۔ مجھے وہاں ایک عجیب تجربہ ہوا۔ جب میں سر بہ سجود ہوا تو وجد آفریں و روح پرور خوشبو نے مشامِ جان کو معطر کر دیا۔ وہ خوشبو ان خشبوؤں سے مختلف تھی جو اس دُنیا میں پائی جاتی ہیں۔ وہ واقعی گلہائے فردوس کی خوشبو تھی۔ روح مسحور و متکیف ہو گئی اور دل سجدے ہی میں پڑے رہنے کے لیے مچلتا رہا۔ ہر بار سجدے میں یہ خوشبو آتی اور کیف وسُرور دیتی رہی۔ میں

نے روضۂ اطہر کے سامنے حاضر ہونے کی کوشش کی، روح حاضری کے لیے بے تاب و بے قرار تھی، دِل حضوری کا طلب گار تھا، لیکن میں وہاں حاضر ہوا تو مجھ پر پھر ہیبت طاری ہوگئی۔ دل جلالتِ پیغمبری کا حریف نہ ہوسکا۔ میری چشمِ تصور کے سامنے وہ منظر اُبھر آیا، جس کا مجھے مشاہدہ ہو چکا تھا۔ میرے سامنے حضورِ پُرنور ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ حضورِ رسالت مآب کی بزم تجلیاتِ ربانی اور آپ کے جمالِ دلفروز کی نُور پاشیوں سے منور تھی۔ روشنی اس قدر حسین و مطہر، سُرور انگیز و کیف پرور اور ایمان افروز و مسحور کُن تھی کہ اس کا اظہار محال ہے۔ یہ نظارہ جتنا جمیل و سُرور انگیز تھا، اس سے بڑھ کر جلیل و مرعوب کُن تھا۔ دِل کو تابِ نظارہ کہاں تھی؟ جسم و روح پر لرزہ طاری ہوگیا، آپ کی ہیبت و جلالت سے مجھ میں وہاں ٹھہرنے کی سکت نہ رہی اور مجھے مجبوراً اپنی جگہ لوٹ آنا پڑا۔ روضۂ اطہر اب میرے پہلو میں تھا۔ میں پُرنم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتا رہا، کبھی ظاہری آنکھ سے مزارِ مبارک کے غلاف کو اور کبھی چشمِ تصور سے روضۂ اطہر کے اندر فردوس بریں میں آپ کی بزمِ حُسن و سُرور کے مناظر ہوشربا سے میری یہ حالت تھی کہ

گاہ میری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

(بالِ جبریل)

نمازِ فجر

میں ان وجد آفرین نظاروں میں محو تھا کہ نمازِ فجر کی اذان ہونے لگی۔ تمام فضا مؤذن کی کیف پرور آواز سے گونج اُٹھی۔ اللہ اکبر کی صدا سے رُوح پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اذان نے ایسا سوز و ساز بخشا کہ قلب و رُوح زندہ و بیدار اور کیف و سُرور سے معمور ہوگئے۔ سُنتیں پڑھیں اور فرض پڑھنے کے لیے اہلِ جذب و شوق کھڑے ہوگئے۔ تکبیر کے بعد امام صاحب نے تلاوتِ قرآن مجید شروع کی تو ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی اور عالم میں پہنچ گیا ہوں، جہاں ہمارا اِلٰہ و رب شاہد بھی ہے اور مشہود بھی۔ حرم شریف میں ملائکہ اور بزرگ ہستیوں کی موجودگی کا احساس بھی

ریز ہونے کے لیے مچلنے لگا۔ یہ بڑا خطرناک مرحلہ تھا۔ یہ زندگی کا بڑا ہی کٹھن اور صبر آزما امتحان تھا۔ مجھے ایک نامعلوم خوف نے لرزہ براندام کر دیا اور دل ڈوبنے لگا۔ وہاں کھڑے ہونے کی مجھ میں سکت نہ رہی، میں ہجوم عشاق میں سے نکل کر روضۂ اطہر کے پہلو میں ریاض الجنۃ کے ایک گوشے میں آ کر بیٹھ گیا اور دیوانہ وار اُسے دیکھتا رہا۔ قلب وچشم روتے رہے اور زبان پر درود شریف جاری رہا۔

ایک خواب، ایک مُشاہدہ

تقریباً چار سال پہلے جب میں رویائے صادقہ میں یہاں حاضر ہوا تھا تو مسجد مبارک کی ہیئت اور تھی۔ وہ چودہ سو برس پہلے کی مسجد تھی۔ روضۂ اطہر کی عمارت بھی اور تھی، وہ نقشہ بالکل مختلف تھا۔ پھر میں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ روضۂ اطہر روضۂ جنت تھا، جہاں حضورِ اکرم ﷺ اپنے صحابہؓ کرام کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ آپ کے حُسن ونُور سے محفل منور ونظر افروز تھی۔ وہ نورانی فضا ملکوتی تھی۔ اس میں روح پرور ٹھنڈک تھی۔ میں حضورِ رسالت مآب کی اُسی بزم کو دیکھنے کا آرزومند تھا۔ یہ آرزو شدت اختیار کر گئی اور دل بے قرار ہو گیا۔ میں تڑپ کر اُٹھا اور پھر روضۂ اطہر کے سامنے حاضر ہو گیا۔ نگاہ مزارِ مبارک کے نظارے کی حریف ہو سکتی تھی، نہ ہوئی۔ ہیبت وجلال رسالت سے کپکپی طاری ہو گئی، ٹانگیں لرزنے لگیں اور دل جلالتِ پیغمبری کی تاب نہ لا سکا۔ روح قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے لیے پَر تولنے لگی۔ درِ جانانِ [درِ جاناں] کے سامنے جان دینا کتنی بڑی خوش قسمتی تھی۔ محبت کی دنیا کی یہ شہادت تھی جو صرف اہلِ مہر ووفا ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ جان دینے کو دل تو چاہتا تھا لیکن وہاں کھڑا رہنے کی تاب وتواں نہ تھی، مجھے مجبوراً اور بادلِ ناخواستہ وہاں سے لوٹ کر ریاض الجنتہ میں آنا پڑا۔ مغرب کی نماز تک وہیں بیٹھا، درود شریف پڑھتا اور روضۂ اطہر کو دیکھتا رہا۔

میرا مشاہدہ ہے کہ ریاض الجنۃ واقعی جنت کا ایک گوشہ ہے۔ میں نے یہاں اپنے آقا ومسیحا سید المرسلین ﷺ کو احباب کے ساتھ جلوہ فگن دیکھا تھا۔ میں اِس حسین ومُسرور انگیز نظارے کو

انسانیت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی وشاگردی کی سعادت نصیب ہوتی! بہرحال اس احساس سے کہ میں اصحابِ صفہ کے مقام پر حاضر ہوں، میرا دل جذباتِ تشکر وممنونیت سے معمور ہوگیا اور سجدے میں گر گیا۔ وہ مقام بھی معطر تھا۔ روح مسرور ہوگئی۔ سجدے سے سر اُٹھایا تو میری نظر روضۂ اطہر پر پڑی۔ دیکھتے دیکھتے منظر بدل گیا۔ چشمِ قلب نے کیا دیکھا اور گوشِ قلب نے کیا سُنا؟ وہ سرّ الاسرار ہے۔ اسرارِ حُسن وعشق کو آشکارا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔ روضۂ اطہر جنت الفردوس کا ایک قطعہ ہے، جہاں آپ اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے اِلٰہ ورب کی حمد وثنا میں مشغول، اور اس کی دید اور جنت کی ان گنت نعمتوں سے محظوظ ومستفیض ہوتے رہتے ہیں۔ روضۂ اطہر میں بلاشبہ مصنوعی روشنی نہیں، لیکن اسے اس کی حاجت بھی نہیں، کیونکہ وہاں ہر وقت آپ کے جمال وجلال کی روشنی رہتی ہے اور اہلِ نظر اُس سے کیف وسُرور حاصل کرتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے حرم نبوی کا اندر اور باہر نمازیوں سے معمور ہوگیا۔ اذان ہوئی، خطبہ ہوا، نماز ہوئی، اور اہلِ جذب وشوق فرطِ اشتیاق وعقیدت سے روضۂ اطہر کے سامنے حاضری کے لیے لپکے، میں نے بھی وہاں حاضر ہونے کے لیے اُٹھنے کی کوشش کی، روح کی طلب وآرزو بھی یہی تھی، لیکن اُٹھنے اور حاضری دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ اہلِ جذب وشوق عصر تک اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے، خصوصاً وہ جو ریاض الجنۃ میں بیٹھے تھے۔

عصر کی نماز سے فارغ ہو کر جب میں چبوترے سے اُترا تو میری نظر ایک بُزرگ پر پڑی اور وہیں ٹھہر گئی۔ اہلِ شوق ونظر ان کے پاس آتے، مصافحہ کرتے اور چلے جاتے۔ میں پہلے دیر تک ان بزرگ کو دیکھتا رہا، پھر آگے بڑھا اور مصافحہ کیا۔ وہ بزرگ خاموش تھے۔ اُنھوں نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ دل نے کہا: "یہ بھی اللہ تعالیٰ کی پُراسرار ہستیوں میں سے ہیں۔" اِس کے بعد وہ پھر دکھائی نہیں دیے، اگرچہ میری نظریں انھیں ہر روز ڈھونڈتی رہیں۔

اگلے روز تہجد کی نماز پڑھنے گئے تو مجھے پھر ریاض الجنۃ میں جگہ نہ ملی۔ میں نے صحنِ حرم

میں نماز پڑھنے کا فیصلہ کیا۔صبح کی نورانی فضا میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے میں نماز پڑھ رہا تھا تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے نُور کی برفباری ہو رہی ہے اور غیر مرئی ملکوتی ہستیاں آسمان سے نیچے اُتر رہی ہیں۔

نور کیا ہوتا ہے؟

نور کیا ہوتا ہے؟ میں نے بار ہا اس کا مشاہدہ کیا ہے۔وہ بے مثل شے ہے۔اسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں، البتہ مثال کے طور پر اُسے برف کے گالوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔نور برف کی طرح گرتا ہے، لیکن اس کا نظارہ بڑا ہی حسین و مطہر اور روح پرور و سرور انگیز ہوتا ہے۔نور بصیرت افروز بھی ہوتا ہے اور ایمان افزا بھی، اور اس میں چشم و رُوح کی ٹھنڈک بھی ہوتی ہے۔سامنے روضۂ اطہر تھا۔اس کے ارد گرد اہلِ جذب و شوق حمد الٰہی اور درود و سلام میں مشغول تھے، کچھ نوافل پڑھ رہے تھے اور کچھ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہے۔

حاضری کی تاب و تواں نہ رہی

میں نے عشاق کو روضۂ اطہر کے سامنے حاضری دینے جاتے دیکھا تو مجھ میں بھی حاضری دینے کی ہمت پیدا ہوئی۔میں بصد ادب و احترام اور دم بخود درِ مبارک پر پہنچا۔درود و سلام شروع کرتے ہی مجھ پر پہلے رقت پھر ہیبت طاری ہو گئی۔چشم و قلب گریہ و زاری کرنے لگے، روح و بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔میرے سامنے اب روضۂ اطہر نہیں، فردوسِ بریں کا ایک وسیع و پُر بہار قطعہ تھا، جو حُسن و نُور کا مقدس سحر کدہ تھا اور اس میں پیکرِ حُسن و نور، سید المرسلین ﷺ اپنے صحابہؓ کرام کے ہمراہ رونق افروز تھے۔آپ کے جمال و جلال کے نظارے کا حریف دل نہ پہلے ہو سکا تھا اور نہ اب ہوا۔دل میں برقِ حُسن لہرائی اور لرزہ براندام کر گئی۔دِل بیٹھنے اور ٹانگیں کانپنے لگیں، اور میں اس سے زیادہ اس پُر جلال منظر کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا، میں زار و قطار روتا اور آہیں بھرتا، وہاں سے رُخصت ہوا، اور صحن میں آ کر بیٹھ گیا۔بار بار سوچتا تھا اور اب بھی سوچتا رہتا ہوں کہ میرا

دل کیوں جلالتِ نبوی کا حریف نہیں ہوسکا؟ یہ راز، رازِ محبت ہے، مخفی ہی رہے تو بہتر ہے۔اس میں ضرور کوئی حکمت ہوگی، جسے "دوست" ہی بہتر جانتا ہے۔

فجر کی اذان ہوئی، جس سے دل زندہ و بیدار ہوتے ہیں۔ پھر نماز ہوئی، تلاوتِ قرآن مجید سن کر روح کیف و وجد کے عالم میں جھوم جھوم اُٹھی۔نماز میں بلاشبہ آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہ واقعی روح کی غذا ہے، مگر اس تجربے سے اہلِ فقر و اصحابِ حُسن و سرور اور اہلِ جذب و شوق ہی گزرتے ہیں۔

نماز سے فارغ ہو کر ہوٹل آئے، ناشتا کیا اور تاریخی و مقدس مقامات کی زیارت کو نکلے۔

[رُودادِ سفرِ حجاز]

☆☆☆☆☆☆☆

پیغامِ اقبال

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ / فیض احمد فیض

دلِ من رازدانِ جسم و جان است
نہ پنداری اجل بر من گران است
چہ غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم
ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است

[علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ]

☆☆☆☆☆

مرا دل رازدارِ جسم و جاں ہے
نہ سمجھو تم اجل مجھ پر گراں ہے
جو کھویا اک جہاں میں نے تو کیا غم
مرے سینے کے اندر سو جہاں ہے

[فیض احمد فیض]

[پیامِ مشرق]

ڈاکٹر انور سدید بے مثال ادیب

قمر زمان☆

گزشتہ چند ماہ کے دوران اردو ادب کی کئی نامور ہستیاں دنیائے فانی سے کوچ کر گئیں۔جمیل الدین عالی، انتظار حسین، اشتیاق احمد ،ظہیر کنجاہی،کمال احمد رضوی ، عبداللہ حسین، فاطمہ ثریا بجیا کے بعد ۲۰ مارچ ۲۰۱۶ء کو اردو کے نامور ادیب، محقق، شاعر، نقاد، کالم نگار، تبصرہ نگار، اور خاکہ نگار ڈاکٹر انور سدید بھی سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ان کا انتقال اردو ادب کا ایک بڑا نقصان ہے۔

ڈاکٹر انور سدید ۴، دسمبر ۱۹۲۸ء کو بھلوال، سرگودھا میں پیدا ہوئے وہ بنیادی طور پر سول انجینئر تھے اور محکمہ آب پاشی سے ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے اپنا آپ اُردو ادب کے لیے وقف کر دیا۔انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے اردو کیا اور پنجاب یونی ورسٹی سے ہی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی؛ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو ادب کی تحریکیں'' تھا۔انھوں نے مختلف اخبارات میں کالم نگاری کی؛ادبی رسائل کے سالانہ جائزے لکھے، کتابوں پر تبصرے لکھے اور ہمہ وقت اردو ادب کی خدمت میں لگ گئے ان کی تصانیف وتالیفات کی تعداد ۸۰ کے قریب ہے، اور یہ سب اردو ادب میں گرانقدر اضافہ ہیں۔ڈاکٹر انور سدید کی اہم تصانیف میں ''اردو ادب کی تحریکیں'' اردو ادب کی مختصر تاریخ'' پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اردو ادب میں انشائیہ، اردو ادب میں سفرنامہ، مختصر اردو افسانہ، اردو افسانے کی کروٹیں، اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش، کے علاوہ شخصیات کے حوالے سے جن میں مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر وزیر آغا، بانو قدسیہ اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر شامل ہیں۔

☆ ایم۔فل اسکالر، ایبٹ آباد

سنڈے میگزین میں شائع ہوا جس میں انھوں نے حمید نظامی، مجید نظامی اور نوائے وقت کے کردار پر روشنی ڈالی۔ مطالعہ کتاب، قلم سے ان کا رشتہ زندگی کی آخری سانسوں تک برقرار رہا وہ اپنے تجربے اور اپنی ریاضت کا نچوڑ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہماری ذہنی بیماریاں کیوں بڑھتی جا رہی ہیں اور مجھے ہمیشہ محسوس ہوا کہ جب سے ہم نے کتاب سے منہ موڑا ہے ہماری زندگی کا اضطراب بڑھ گیا ہے۔ روپیہ پیسہ ہماری دولت ہمارے ظاہری لباس اور شکل وصورت کو خوبصورت بناتی ہے کتاب ہمیں نمائش ذات بے جا نخوت اور غرور وتکبر کی راہ پہ ڈالتی ہے مطالعہ ہمیں سیر نظری عطا کرتا ہے'' [کتب مینار۔ انور سدید]

ڈاکٹر انور سدید نے چونکہ یہ راز پا لیا تھا اس لیے انھوں نے اپنی زندگی کو مطالعہ کے لیے وقف کر دیا اور عمر بھر اس کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ ان کی تحریروں اور ان کے مطالعہ میں اتنا تنوع ہے کہ ان کے معاصرین میں سے شاید ہی کسی اور ادیب کے ہاں ایسا دکھائی دے۔ ان کی کتابوں کے علاوہ بہت ساری ایسی تحریریں مختلف رسائل میں بکھری پڑی ہیں کہ اگر انھیں جمع کیا جائے تو کئی مزید کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ ممتاز انشا پرداز دانشور مختار مسعود نے آوازِ دوست میں ایک جگہ لکھا کہ:

''حشر کے دن بہت سے لوگ اعمال نامے ہی نہیں کتابیں لیے ہوئے بھی کھڑے ہوں گے، سر سید کے ہاتھ میں مسدس حالی کا نسخہ ہوگا۔ سلطاں جہاں بیگم نے سیرۃ النبی ﷺ کی جلدیں اٹھائی ہوں گی۔ حمید اللہ کے ہاتھ میں ضرب کلیم ہوگی۔ مغفرت کے بھی خدا نے کیا کیا سامان پیدا کیے ہیں۔''

مختار مسعود کی یہ تحریر مجھے شفیع ہمدم کا انور سدید کے حوالے سے خاکہ پڑھ کر یاد آئی انھوں نے مرزا ادیب سے ڈاکٹر انور سدید کی ایک گفتگو کا ذکر کیا ہے؛ لکھتے ہیں۔ انور سدید نے مرزا ادیب سے کہا تھا:

''روزِ قیامت میرے اعمال کی پرسش ہوگی تو میں اپنی ساری کتابیں اللہ میاں کے

سے ڈاکٹر انور سدید نے ۲۶ مارچ ۲۰۱۳ء کو کاظم جعفری کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ الیکٹرانک میڈیا نے پرنٹ میڈیا پر منفی اثرات ڈالے ہیں اور یہ ادب کے زوال کا دور ہے۔ میں اس سے متفق نہیں۔ کتاب کا اپنا ایک تہذیبی مدار ہے اور یہ ادب کا ایک مستقل حوالہ ہے اردو ادب میں بھی لکھنے والوں کا اضافہ ہوا ہے کتابوں کی اشاعت کی رفتار بھی تیز ہوئی ہے" [روزنامہ "دنیا" راولپنڈی ۲۶ مارچ ۲۰۱۳ء]

ان کی کتاب سے وابستگی غیر مشروط تھی۔ پڑھنا اور لکھنا ان کی زندگی کا سب سے مضبوط حوالہ تھا۔ انھوں نے متنوع موضوعات پر لکھا اور اپنے معاصرین سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ دنیا سے کوچ کر جانے والے کسی معاصر کا تعزیت نامہ ہو یا مشاہیر میں سے کسی کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہو، نوواردانِ ادب کی حوصلہ افزائی ہو، کسی نئی کتاب کا تعارف ہو یا کسی علمی و ادبی مجلے کا تجزیہ ہو ڈاکٹر انور سدید ہر موضوع سے انصاف کرتے تھے ان کی اسی متنوع اور ہمہ جہت شخصیت کے بارے میں رفاقت علی شاہد نے لکھا ہے کہ

"ڈاکٹر انور سدید ہمارے دور کا اثاثہ ہیں۔ ان کی ہمہ جہت ادبی خدمات نے ان کی ادبی شخصیت میں تنوع پیدا کیا ہے۔ اسی طرح ادبی تنقید میں ان کی مایہ ناز مستقل تصانیف نے ان کو اعتبار بخشا ہے۔ ان دونوں جہتوں نے مل کر ان کی ناموری میں روز افزوں اضافہ کیا ہے"

[ماہنامہ "قومی زبان" کراچی مارچ ۲۰۱۶ء]

ڈاکٹر انور سدید نے اپنے مشاہیر کی عزت و آبرو کو ہمیشہ مقدم رکھا ہے اور ان کے علمی و ادبی دوست ڈاکٹر وزیر آغا کے اختلافات کے دور میں احمد ندیم قاسمی سے وابستہ لوگ ڈاکٹر وزیر آغا کے حوالے سے اگر کوئی نارو ابات کرتے تھے تو ڈاکٹر انور سدید اس کا ڈٹ کر جواب دیتے تھے۔ یہ چپقلشیں احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے چاہنے والوں کے درمیان کافی عرصہ تک چلتی رہیں۔ جو لوگ احمد ندیم قاسمی کے "فنون" میں شائع ہوتے تھے وہ وزیر آغا کے "اوراق" میں نظر نہیں آتے تھے اور اسی طرح "اوراق" والے "فنون" میں نہیں چھپتے تھے۔ تاہم ڈاکٹر انور سدید

نے احمد ندیم قاسمی کے انتقال کے بعد اپنی سوچ کافی تبدیل کر لی تھی؛ اور وہ کوئی ایسی بات نہیں لکھتے تھے جو خلاف شان ہو۔ ڈاکٹر انور سدید شخصیت نگاری کے حوالے سے اردو ادب میں اہم مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے معاصرین کے خاکے بھی لکھے؛ اور مشاہیر کی علمی وادبی حیثیت کو بھی اجاگر کیا۔ مثلاً ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو غالب کے حوالے محاسن کلام غالب'' لکھنے کے بعد بڑی اہمیت حاصل ہوئی تھی۔ ڈاکٹر انور سدید نے ان کے حوالے سے لکھا تھا کہ

''بجنوری کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے فرمودۂ غالب کو یقین کامل کا درجہ دیا اور اسے وید کے بعد ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب تسلیم کر لیا۔ اور اپنی مدلل تنقید اور مغرب کے شاعروں، فلسفہ دانوں اور دانشوروں کے خیالات سے غالب کے اشعار کے موزوں سے اپنے دعوے کو ثبوت فراہم کر دیا۔'' [ہفت روزہ ''ندائے ملت'' ۸ تا ۱۴ نومبر ۲۰۰۲ء]

ڈاکٹر انور سدید ایک ذونویس ادیب تھے اور بیک وقت کئی کئی موضوعات کا احاطہ کرتے تھے۔ اس حوالے سے انھیں اپنے معاصرین میں ایک منفرد مقام حاصل تھا۔ اور یہ مقام ان کی علمی ریاضت اور ادب سے اپنی کمٹمنٹ کا ثمر تھا۔ ان کی اس خوبی کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر انور سدید نے اردو ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ بے مثال ہیں کوئی شخص اتنا کچھ اسی صورت میں کر سکتا ہے جب ادب اس کے لیے اسلوبِ زندگی ہو اور وہ ادب کو اتنا ہی ناگزیر سمجھتا ہو جتنا ضروری سانس لیتا ہے'' [ماہنامہ تخلیق، لاہور]

ڈاکٹر انور سدید کی رفتارِ ادب کا جائزہ لینے کے لیے چند مثالیں ہی کافی ہیں۔ حالیہ دنوں میں شائع ہونے والے ادبی رسائل میں انھوں نے متنوع موضوعات پر لکھا جس سے قارئینِ ادب کے بڑے حلقے نے استفادہ کیا۔ ماہنامہ ''قومی زبان'' کراچی کے فروری کے شمارے میں انھوں نے ضلع وہاڑی کی تحصیل میلسی کی معروف جھنڈیر لائبریری پہ مضمون لکھا جس کا عنوان تھا۔ ''پاکستان کا واحد اقامتی، تحقیقی کتب خانہ، لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''الحمرا''

کا جنوری میں سالنامہ شائع ہوا جس میں ڈاکٹر انور سدید نے مولانا حامد علی خان اور پروفیسر زہیر کنجاہی مرحوم پر لکھا؛ اور دوسری طرف قرۃ العین کے ناول ''سفینۂ غم دل'' پر تاثراتی مضمون لکھا۔ اسی شمارے میں ''کچھ وقت کتابستان میں'' کے زیر عنوان کتابوں پر تبصرے کیے۔

''الحمرا'' ہی کے فروری ۲۰۱۶ء کے شمارے میں ''مغرب اور مشرق میں انشائیہ، مزاح نگار مشفق خواجہ اور کتابوں پر تبصرے کیے۔ مارچ کے ''الحمرا'' کے شمارے میں گوشۂ انتظار حسین کی یاد میں جمیل الدین عالی شاعر کار؛ اور کتابوں میں تبصرے لکھے۔ مارچ ہی کے ماہنامہ ''تخلیق'' میں انھوں نے نیر جہاں، اظہر جاوید کی شخصیات پر لکھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی فیض شناسی کو موضوع بنایا اور کچھ وقت ماہنامہ ''تخلیق'' کے ساتھ میں تخلیق کا تجربہ کیا۔ اس کے علاوہ مندرجہ بالا تمام رسائل میں ان کے علمی وادبی خطوط علیحدہ شائع ہوئے۔ یہ چند ایک وہ رسائل ہیں جو ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ یقیناً اُن کا دائرہ کار اِس سے زیادہ ہے، اس لیے سجاد نقوی نے ان کی پچھترویں سالگرہ پر ''اوراق'' میں ایک مضمون میں انھیں یوں خراج تحسین پیش کیا کہ:

''لسان العصر اکبر الہ آبادی نے سرسید کی پچھترویں سالگرہ پر کہا تھا۔ ہماری فقط باتیں ہیں سید کام کرتا ہے۔ میں جب اپنے محترم دوست ڈاکٹر انور سدید پر مضمون لکھنے کا ارادہ کیا تو اکبر الہ آبادی کا یہ مصرعہ میرے ذہن پہ اس درجہ وارد ہوگیا کہ میں نے جانا اگر اکبر الہ آبادی ہمارے عہد میں زندہ ہوتے تو وہ انور سدید کی علمی وادبی مصروفیات دیکھ کر اپنے مصرعے میں تصرف کر کے سید کی جگہ انور کر دیتے'' [اوراق۔ مارچ۔ اپریل ۲۰۰۴ء]

اپنے معاصرین سے اس درجہ داد و تحسین حاصل کرنا بجائے خود ایک کارنامہ ہے جس کے بلاشبہ ڈاکٹر انور سدید مستحق ہیں مگر اس کے پیچھے ان کی برسوں کی محنت اور ریاضت کار فرما ہے۔ انھوں نے اپنی ۸۷ سالہ زندگی میں ان تھک جہد و جہد کی ایک مثال قائم کی۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک مصروف عمل رہے۔ بیس مارچ کو ان کے انتقال والے دن بھی ان کا ایک مضمون باعنوان ''علم وادب اور فروغ کتب میں نوائے وقت کا کردار'' روزنامہ نوائے وقت کے

طنز و مزاح میں غالب کے نئے خطوط، اور دلا ور فگاریں، خاکوں کے ۲ مجموعے اور سفر نامے بھی لکھے۔ ڈاکٹر انور سدید اردو کے ہمہ وقت مصروف رہنے والے ادیب تھے وہ عمر بھر ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ ادب کے حوالے سے انھوں نے ''اُردو ادب کی تحریکیں'' کے پیش لفظ میں اہم نقاط پر روشنی ڈالی۔ لکھتے ہیں:

''ادب کی توانائی کا اندازہ تخلیقات کی تعداد سے لگانا غلط ہے بلکہ ادب کی توانائی تو اس کے فکری عنصر اور احساس کی گہرائی سے حاصل ہوتی ہے۔ جس ادب میں فکر کا عنصر کم اور سطحیت زیادہ ہو؛ وہ ادب نہ تو زیادہ دیر تک زندہ رہ سکے گا اور نہ عوام ہی کو بالواسطہ طور پر متاثر کر سکے گا۔ ادب پر جمود اس وقت طاری نہیں ہوتا جب چند سالوں کے لیے تخلیق کی رفتار مدہم پڑ جاتی ہے بلکہ اس وقت جب فکر کی راہیں مسدود ہو جائیں اور سوچ کا کارواں ایک گھسی پٹی شاہراہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔''

ڈاکٹر انور سدید کے معاصرین اور ان کے قریب رہنے والے لوگ ان کی فکر سے ہمہ وقت روشنی حاصل کرتے رہے۔ ان کے نظریات غیر محسوس طریقے سے عوام کو متاثر کرتے رہے وہ ایک مخلص اور کمٹڈ ادیب تھے؛ اور انتھک محنت پر یقین رکھتے تھے ان کی شخصیت کے حوالے سے رضی الدین رضی نے لکھا ہے کہ

''ڈاکٹر انور سدید کے قریب رہ کر مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا وہ کسی صلے اور ستائش کی پرواہ کئے بغیر تخلیقی و تحقیقی سرگرمیوں میں مگن رہتے تھے وہ ہم جیسے لوگوں کے لیے ایک مثال تھے'' [روزنامہ ''دنیا'' ۲۱ مارچ ۲۰۱۶ء]

قلم و قرطاس اور کتاب کی محبت ان کے خون میں رچی بسی تھی۔ وہ کسی تحریک سے باقاعدہ عدم وابستگی کے باوجود اپنے خیالات میں واضح نقطہ نظر رکھتے تھے۔ کتاب کے حوالے سے وہ ایک واضح مؤقف کا اظہار کرتے تھے۔ دورِ جدید کے حوالے سے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں جدید ٹیکنالوجی کے آنے سے کتاب کی اور لکھے ہوئے لفظ کی اہمیت کم ہو گئی ہے اس حوالے

حضور پیش کردوں گا اور کہوں گا یہی میرا اعمال نامہ ہے"
مرزا ادیب بولے:

"اگر اللہ میاں نے یہ اعمال نامہ قبول نہ کیا تو"؟
"نہیں وہ تنگ نظر نقاد بھی نہیں ہیں جنھیں صرف اپنوں کی تحریریں پسند آتی ہیں اور دوسروں میں سو سو کیڑے دکھائی دیتے ہیں وہ میری عبادت قبول کر کے مجھے داخل بہشت ہونے کی اجازت دے دیں گے۔"

بلاشبہ ان کا علم و ادب کے حوالے سے کام گراں قدر ہے کہ انھیں ہمیشہ اپنی اس جداگانہ حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔ انھیں ان کی خدمات کے صلے میں اپنے عہد میں عزت سے نوازا گیا۔ حکومت کی طرف سے بھی انھیں تمغۂ امتیاز سے سرفراز کیا گیا۔ جبکہ اپنی تصانیف کے اوپر انھیں رائٹرز گلڈ ایوارڈ، نقوش ایوارڈ، ہجیرہ ایوارڈ، پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی ایوارڈ سے نوازا گیا۔
ڈاکٹر انور سدید ایک بھرپور علمی و ادبی زندگی گذارنے کے بعد ۲۰ مارچ ۲۰۱۶ء میں انتقال کر گئے ان کا یہ شعر ایک گہری معنویت کا حامل ہے۔

ڈھونڈ! اپنا آشیانہ آسمانوں سے پرے
یہ زمیں تو ہوگئی نا مہرباں انور سدید

☆☆☆☆☆☆

توحیدِ خالص

قسط۔۔۔۵

حضرت خواجہ غلام زین الدینؒ

صفاتِ خداوندی نہ عین ذات ہیں نہ غیرِ ذات، بلکہ لازم ذات ہیں۔اس مثال سے یہ بات بھی نکل آئی کہ صفاتِ خداوندی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ایسی نسبت رکھتی ہے کہ ان کو نہ عین ذات کہہ سکتے ہیں جیسا کہ نور کو نہ آفتاب کا عین کہہ سکتے ہیں نہ غیر؛ بلکہ یہ کہیں گے کہ آفتاب تو معدنِ نور اور منبعِ ضیا کا نام ہے اور نور اس کے لیے لازم ہے۔ جیسا کہ چار کے لیے زوجیت اور پانچ کے لیے فردیت اسی طرح صفاتِ خداوندی ذاتِ باری کے لیے لازمِ ذات ہیں کہ ان صفات اور کمالات کا ذاتِ خداوندی سے جدا ہونا ناممکن اور محال ہے۔

یہی تمام اہلِ سنت والجماعت اور اشاعرہ اور ترید یہ کا مسلک ہے کہ صفاتِ خداوندی لازم ذات ہیں اور اسی کو امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس سرہ نے مکتوبات میں اختیار فرمایا ہے اور حکماء اور صوفیہ جو عینیت کے قائل ہوئے ہیں ان کو شدومد کے ساتھ رد کیا ہے۔

نمبر۵:۔صفت السمع:۔یہ صفت خدائی ہے جس کا تعلق مسموعات کے ساتھ ہے۔

نمبر۶:۔صفت البصر:۔یہ صفت ازلی ہے جس کا تعلق مبصرات سے ہے۔

نمبر۷:۔صفتِ کلام:۔**وھو ای اللہ تعالیٰ متکلم بکلام النفسی**،کلام صفتِ ازلی ہے جو کہ المسمی بالقرآن المرکب من الحروف۔مراد اس سے یہ ہے کہ صفاتِ الٰہیہ میں قرآن سے مراد معنی قدیم ہے جو کہ قائم اللہ کی ذات کے ساتھ ہے اور یہ قرآن جو مرکب حروف الہجاء سے ہے یہ حادث ہے اور صفتِ قدیمہ قائمہ اللہ کی ذات سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس کلام قدیم پر دلالت کرنے والا ہے۔پہلی کو کلام نفسی کہا جاتا ہے اور دوسری کو لفظی کہا جاتا ہے۔یہ وہ صفتیں ہیں جن سے اللہ کی ذات کسی وقت بھی خالی نہیں ہوتی۔اِس لیے یہ صفاتِ ذات ہیں اور صفات الافعال حادث ہیں

ان سے اللہ کا خالی ہونا جائز ہے۔ جیسے تخلیق، ترزیق، تصویر اور مثل اِس کی؛ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حوادث اللہ کی ذات سے قائم ہوگئے؛ کیونکہ اِضافات اور اعتباری ہیں ان کا وجود خارج میں نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صفات اللہ تعالیٰ نے عین ذات ہیں؛ اور نہ غیر ذات میں یہ فی نفسہا ممکن ہیں۔ واجب لذات الواجب ہیں۔ نہ لذاتہا، پس توحیدِ باری تعالیٰ اپنی ساری قسموں کے ساتھ بیان ہوگئی۔ **والحمد الله علی ذالک.**

اب یہاں ایک مسئلہ بیان کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے، جو سچے مواحدین اولیاء اللہ کی مزارات پر فیض حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں اور بعضے گمراہ لوگ ان کو مشرک، پیر پرست یا بدعتی کے الفاظ سے پکارتے ہیں۔ یہ تعصب اور جہالت ہے۔ لہٰذا ایسے فرقے کی اور لفظ شرک کفر کی پوری تشریح کی جاتی ہے تا کہ مسئلہ خوب ذہن نشین ہوجائے۔

اہلِ حق سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اولیاء اللہ سے امور خارقِ عادت کا ظاہر ہونا جیسے ہوا پر چلنا، دریا پر چلنا، دُور سے آواز سُن لینا، دور سے دیکھ لینا، غائبانہ امداد کرنا، مشکل امور کا ان کی دعا و توجہ سے آسان ہوجانا وغیرہ وغیرہ ممکن اور واقع ہیں۔

موجودہ دور میں یہ وبا عام پھیل چکی ہے اور پھیلتی جارہی ہے کہ اولیاء اللہ کو حاجت روا سمجھ کر ان کے آگے حاجت روائی کی التجا کرنا شرک ہے۔ اولیاء اللہ کو دور سے سننے والا، دیکھنے والا سمجھ کر حاجت روائی کے لیے پکارنا شرک ہے، قبورِ اولیاء اللہ پر جانا شرک ہے، مزار کو بوسہ دینا شرک ہے، یہ عقیدہ رکھنا کہ اہلِ قبور ہمارے کسی قسم کی امداد کر سکتے ہیں؛ شرک ہے اور ان امور کے شرک ہونے پر قرآنِ کریم کی وہ آیات پیش کی جاتی ہیں جو کفار اور ان کے بتوں کے حق میں وارد ہوتی ہیں۔ یعنی قرآن کریم میں جہاں اصنام یعنی بتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ان کے نزدیک اس سے مراد قبورِ انبیاء و اولیاء ہیں اور "مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ" سے مراد انبیاء، اولیاء ہیں اور انبیاء و اولیاء کی تعظیم کرنے والے مشرک اور کافر ہیں۔ یعنی ان حضرات کے نزدیک کفار کے بت اور انبیاء و اولیاء کی

مزارات بالکل یکساں ہیں اور اولیاء اللہ کی تعظیم کرنا، ان کے پاس حاجات لے جانا اور ان کو باذن اللہ حاجت روا سمجھنا ان کو رب اور خدا سمجھنا جو کہ شرک ہے اور ان امور کے عامل مشرک و کافر ہیں۔
یہ ہے ان حضرات کے مسلک کا مختصر سا خاکہ، اب اس کے متعلق پہلے اس بات کو ذہن نشین فرمالیں کہ ان حضرات کا یہ عقیدہ خارجیوں کی اتباع ہے۔ صحیح بخاری شریف "باب قتال الخوارج والملحدین" پارہ اٹھائیسواں، صفحہ ۱۰۴۲، مطبوعہ مجتبائی میں بخاریؒ نے حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کا ایک قول ذکر فرمایا ہے۔ وکان ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنهما یراهم شرار الخلق وقال انهم انطلقو الی ایا تِ نزلت فی الکفار فجعلو ھاعلی المومنین.
یعنی ابنِ عمرؓ خوارج کو بدترین مخلوق سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ اس راستہ پر چلے ہیں کہ جو آیاتِ قرآن کریم میں کفار کے حق میں نازل ہوئی ہیں؛ ان کو انھوں نے مسلمانوں پر منطبق اور چسپاں کر دیا۔ جاننا چاہیئے کہ خوارج وہ فرقہ ہے کہ باوجود کلمہ گو ہونے کے مدعی اسلام ہونے کے نماز وغیرہ اعمال اسلام پر کاربند ہونے کے حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ لڑائی کرنے اور ان کو قتل کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اور ان کے علامات ذکر فرمائے جیسے کہ احادیثِ شریفہ میں مذکور ہیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی دورِ خلافت میں ان سے لڑائی کی اور ان کو قتل کیا اور حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے جو کہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ اس بنا پر کہ انھوں نے آیاتِ کلام اللہ میں تحریف کی ہے۔ یعنی جو آیات کفار کے حق میں نازل ہوئی ہیں ان کو مسلمانوں پر چسپاں کر دیا ہے لہٰذا ان پر بدترین مخلوق ہونے کا فتویٰ صادر فرمایا ہے۔ تو جو حضرات کہ خوارج کی تقلید میں یہی مسلک اختیار کریں ان کا حال ظاہر ہے۔ اب وہ الفاظ جن سے یہ متبعینِ خوارج سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ ان سے چند الفاظ کے معانی کا مطابق اصطلاح قرآن وحدیث ذکر کرنا ضروری ہے تا کہ طالبِ حق پر حقیقت واضح ہو جائے اور ان کے دھوکہ سے بچ جاوے وہ الفاظ یہ ہیں۔

(۱) رب (۲) شرک (۳) ولی (۴) من دون اللہ (۵) دعا

(۶) عبادت۔

اول رب کی تعریف جو کہ متبعین خوارج نے کی ہے غلط ہے۔ کیونکہ قرآن میں ہے کہ سلیمان علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تین میل کی مسافت سے (کیونکہ فوج سلیمانی کا احاطہ تین میل تھا جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے) ایک چیونٹی کی آواز کوسُن لیا اور اس پر تبسم فرمایا۔ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكاً مِّنْ قَوْلِهَا، یعنی سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی نملہ کے قول سے تبسم فرمایا۔ یہ غائبانہ مسافتِ بعیدہ سے سن لینا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر نبوی پر مدینہ طیبہ میں کھڑے ہو کر ساریہ امیرِ فوج کو ایک مسافتِ بعیدہ پر اپنی آواز سنا دی، اس کی حالت کو دیکھ لیا۔ یہ ہے مسافتِ بعیدہ پر غائبانہ دیکھنا اور آواز کا پہنچا دینا، سُنا دینا، تو ایسے امور خارقِ عادت انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام اور اولیاء اللہ سے صادر ہوتے رہے ہیں۔ ان کی بنا پر کسی نے ان کو رب نہیں سمجھ لیا اور موجودہ دور میں تو سائنس نے آواز کو دور پہنچانا اور دور سے آواز کو کھینچ لینے کو عام فہم کر دیا ہے۔ جب یہ امور مادیات کے ذریعہ سے ممکن اور واقع ہیں تو روحانیت سے بطریقہ اولیٰ یہ امور ممکن ہیں۔ کیونکہ روح کی طاقت مادہ سے زیادہ ہے۔ یہ علاوہ چیز ہے کہ کسی نے اپنی عقائدِ فاسدہ اور اعمالِ خبیثہ سے روح کی طاقت کو بیکار کر دیا ہو۔ رب کی تفسیر صحیح وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب یہ آیت اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ، نازل ہوئی تو عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کہ عیسائیت سے مسلمان ہوئے تھے۔ عرض کی یا رسول اللہ! ہم احبار و رُہبان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہ تمھارے لیے اشیاء کی حرمت اور حلّت کے فتوے نہیں دیتے تھے اور تم ان کے اقوال پر عمل کرتے تھے؟ عرض کی عدیؓ نے ہاں یا رسول اللہ! فرمایا حضرت نے کہ یہی چیز ہے ربّ بنانا۔ اس فرمانِ نبوی نے بیان فرمایا کہ کسی کو رب بنانے کا یہ معنیٰ ہے کہ کسی کو اشیاء کے حرام اور حلال کرنے کا مختار سمجھے اور اس کے قول کو واجب التسلیم سمجھ کر اس پر عمل کرے۔ غائبانہ مسافتِ بعیدہ سے دیکھنے والا اور سننے والا وغیرہ وہ امور جن کا بطور خرقِ عادت عباد اللہ سے

صادر ہونا قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی سے ثابت ہو؛ کسی ولی اللہ میں ان اوصاف کے ہونے کا عقیدہ رکھنا نہ اس کو ربّ بنانا ہے اور نہ شرک ہے۔ اور اشیاء کی حرمت وحلت صرف بذریعہ وحی جلی یا خفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ہوسکتی ہے اور حلال خدا کو حلال جاننا اور حرام خدا کو حرام جاننا ایمان اور اس کا عکس کفر ہے۔ لہٰذا غیر اللہ کو حرام وحلال کرنے کا مختار سمجھنا اس کو ربّ بنانا ہے اور کفر ہے۔

☆☆☆☆☆

حضرتِ نذر صابریؒ کی ڈائری کا ایک ورق

اگر کوئی کہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ تقدیر یزداں کے مطابق کر رہا ہوں تو اس سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم تقدیر یزداں کو دیکھ کر کے آئے ہو۔ ایک بزرگ نے کہا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ پوچھا وہ کیونکر [؟] کہا میری اپنی کوئی مرضی نہیں؛ اس کی مرضی ہی میری مرضی ہے۔ یہ کمال سپردگی اور تسلیم ورضا کا مقام ہے۔ ایک بار چناب بپھر گیا اور اس نے شہر (گجرات) کا رخ کیا۔ لوگ شاہ دولاؒ کے پاس آئے۔ آپ نے کدال سے لہروں کی ہموائی شروع کر دی۔ کہا یہ کیا؟ فرمایا: جدھر میرا مولا۔ اُدھر شاہ دولا۔ یہ ان لوگوں کی ادائیں ہیں۔ جو خدا کو موہ لیتی ہیں۔ جو خدا کا ہو گیا خدا اُس کا ہو گیا۔

مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ

مگر اقبال اِس کے مقابلے میں کہتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

پہلے خودی اور تقدیر کو define کیا جائے پھر دوسرے مصرع کے معنٰی متعین ہوں گے۔ سیدھا راستہ وہی ہے جو انبیاؑ کا ہے اسی پر چل کر دو عالم کی سرخروئی حاصل ہوتی ہے۔ یہ بہت دشوار بھی ہے۔ عزیمت کا راستہ ہے تاہم اَلدِّیْنُ یُسْرًا کے مطابق لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا نے آسانیاں بھی پیدا کی ہیں۔ تکلیفات شرعیہ کا پورا انظام ہر شخص کے لئے اس کی ہمت کے مطابق ہے اور اسی حساب سے حشر میں باز پرس ہوگی۔ زیادہ فلسفہ اور حکمت کو مت تلاش کرو۔ دین سیدھا سادا ہے اس کو اپنی کجروی سے پیچیدہ نہ بناؤ۔

۲۸ دسمبر ۲۰۱۲ء

إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا

علامہ سعید الزماں نورسیؒ

ایک عمر، جسم اور منصب میں بڑے آدمی نے ایک دن مجھ سے کہا: نماز پڑھنا کام تو بہت اچھا ہے، لیکن روزانہ پانچ وقتوں میں پانچ دفعہ ادا کرنا بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے انسان اکتا سا جاتا ہے!۔۔۔

اس بات پر ایک لمبا عرصہ گزر گیا، پھر ایک دن اچانک میں نے اپنے ''من'' کی آواز پر کان دھرا تو سنا کہ وہ بالکل وہی الفاظ دہرا رہا ہے! میں نے تھوڑی دیر کے لیے غور کیا تو پتہ چلا کہ میرے من نے بھی سستی اور کسلمندی کی راہ سے شیطان سے وہی سبق حاصل کر لیا ہے، تب مجھے یقین ہو گیا کہ اس آدمی نے جب یہ کلمات کہے تھے تو گویا کہ اس نے تمام نفسہائے امارہ کی زبان سے مستعار لیے تھے، یا یوں کہو کہ تمام نفسہائے امّارہ نے اس کے زبان سے یہ الفاظ کہلوائے تھے۔۔۔تو میں نے کہا: میرا نفس جو کہ میرے پہلو میں ہے، جب حالت یہ ہے کہ یہ برائی پر اکساتا رہتا ہے، تو یہ بات ضروری ہے کہ میں آغاز اسی سے کروں، کیونکہ کہتے ہیں کہ: ''جو خود اپنی اصلاح نہ کر سکے وہ دوسروں کی اصلاح کسی بھی صورت نہیں کر سکتا ہے''۔۔۔بنا بریں، میں نے اپنے من یا نفسِ امّارہ کو مخاطب کر کے کہا:

اے میرے نفس!

جہل مرکب کی دلدل میں سرتاپا ڈوبے ہوئے اور کاہلی کے بستر پر غفلت کی نیند میں مدہوشی کی حالت میں پڑے ہوئے تم نے یہ جو بڑا بول بولا ہے نا، اس کے مقابلے میں، میں تمہیں پانچ تنبیہیں سناتا ہوں، ان پر غور کرو:

پہلی تنبیہ: میرے نصیبوں جلے من! کیا تمہاری عمر کبھی ختم نہیں ہوگی؟ کیا تمہارے پاس اس چیز کی قطعی ضمانت ہے کہ تم اگلے سال تک، بلکہ کل تک زندہ رہو گے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر عمر دوام کے وہم میں مبتلا رہ کر تم نماز کے تکرار سے اکتانے اور گھبرانے کیوں لگے؟ یہ ناز ونخرہ جس کا اظہار تم کر رہے ہو اس سے تو ایسے لگتا ہے کہ تمہیں اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ تم اس دنیا میں ہمیشہ رہو گے!!! اگر تم یہ بات سمجھ جاؤ کہ تمہاری عمر نہایت مختصر ہے اور یہ بری طرح بے فائدہ ضائع ہو رہی ہے، تو اس بات میں کوئی شک نہیں کہ چوبیس گھنٹوں میں سے صرف ایک گھنٹہ ایک ایسی خدمت اور ایسی ذمہ داری میں صرف کرنا جو

انتہائی خوبصورت، پرلطف راحت بخش، تمہارے لیے سراپا رحمت اور ابدی اور ہمیشہ کی پُر سعادت زندگی کا ایک بہت بڑا وسیلہ ہے؛ یہ ایک گھنٹہ تمہارے لیے یقیناً گرانبار اور اکتاہٹ کا باعث نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ شوقِ خالص اور ذوقِ عالی کو مہمیز دینے والا بہترین وسیلہ ثابت ہوگا۔

دوسری تنبیہ: میرے ندیدے من! تم ہر روز روٹی کھاتے ہو، پانی پیتے ہو، سانس لیتے ہو، کیا ان سب کاموں کا تکرار تنگدلی اور اکتاہٹ پیدا نہیں کرتا؟؟۔۔۔ بے شک نہیں۔۔۔؛ کیونکہ ضرورت کا تکرار ملال کا باعث نہیں بلکہ لذت کی تجدید کرتا ہے، اس لیے نماز جو کہ میرے دل کو غذا فراہم کرتی ہے، میری روح کے لیے آبِ حیات ہے اور میرے جسم میں پوشیدہ لطیف ربانی احساسات کے لیے بادِ نسیم کا جھونکا ہے، ضروری ہے کہ تمہیں اس طرح کا بنادے گی کہ پھر تم کبھی بھی اکتاہٹ یا بیزاری کا اظہار نہیں کرو گے۔

جی ہاں!

بے شک وہ دل جو بے حد وحساب ہموم وغموم اور آلام ومصائب سے دوچار رہتا ہے، جو بے حد وحساب آمال ولذائذ پر فریفتہ رہتا ہے، اس دل کے لیے قوّت اور غذا کا حصول ایک ہی طریقے سے ممکن ہے، اور وہ یہ کہ وہ مکمل گریہ زاری کا وسیلہ لے کر اس رحیم وکریم کا دروازہ کھٹکھٹائے جو **عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر** ہے؛ اور بے شک وہ روح جس کا تعلق ان مخلوقات کے ساتھ بہت زیادہ ہے جو اس فانی دنیا میں تیز رفتاری سے آتی اور چلی جاتی ہیں، وہ روح آبِ حیات سے صرف اسی صورت میں سیراب رہ سکتی ہے جب وہ نماز کے ذریعے اس معبودِ باقی اور محبوبِ سرمدی کی رحمت کے چشمے کی طرف رخ کرلے گی۔

انسان کے جسم میں پایا جانے والا وہ لطیفہ جسے ''سِرّ'' کہا جاتا ہے، وہ لطیفہ جو انتہائی حسّاس اور گہرے شعور اور اتھاہ لطافت کا مالک ہے، وہ ایک نورانی اور ربانی لطیفہ ہے، جو دوام وخلود کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ فطری طور پر وہ دوام وخلود کا مشتاق ہے اور اُس جلالت مآب ذات کی تجلیات کو منعکس کرنے والا آئینہ ہے۔۔۔ اس حساس لطیفے کو اس دنیا کے تنگ وتاریک، گلوگیر، عارضی اور مہلک حالات سے جنم لینے والی اس مشقت، قساوت، دباؤ اور تناؤ بھری فضا میں سانس لینے کی سخت ضرورت ہے، اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ جب وہ نماز کی کھڑکی کے روبرو کھڑا ہو کر تازہ ہوا اندر کھینچے۔

تیسری تنبیہ: اے میرے بے صبرے من!۔۔۔ آج تم ماضی میں کی ہوئی عبادت سے ملنے والی

تکلیفوں، مشقتوں اور نماز کی صعوبتوں اور سابقہ مصائب سے لاحق ہونے والی زحمتوں کو یاد کر کے تلملاتے ہو، اور پھر آنے والے دنوں میں عبادات وواجبات، نمازوں کو ادا کرنے کی خدمات اور مصائب کی تکلیفوں کے بارے میں سوچتے ہو اور پھر جزع فزع کرتے ہو، قلتِ صبر بلکہ عدم صبر کا مظاہرہ کرتے ہو۔ خود ہی بتاؤ کہ ایسی حرکت کسی بھی ایسے آدمی سے صادر ہو سکتی ہے، جس کے پاس تھوڑی سی بھی عقل ہو؟ اس بے صبری کے مظاہرے کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہونا سوائے حماقت اور بیوقوفی کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا ہے، یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کل کو لاحق ہونے والی بھوک اور پیاس کے خوف اور فکر سے آج ہی چیخنا چلانا شروع کر دیا جائے کہ اب کیا بنے گا! مجھے تو کل بہت سخت بھوک لگے گی!!

جب حقیقت یہی ہے، تو پھر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ صرف آج کی عبادت کے لیے صرف آج ہی سوچو اور کہو کہ: آج کے دن سے ایک گھنٹہ میں ایک خوبصورت، لذیذ اور بہت زیادہ اہمیت کے حامل فریضے کی ادائیگی اور اس انتہائی عظیم اور بلند مرتبے والی خدمت میں صرف کروں گا جس میں تکلیف تو برائے نام ہے لیکن اس کا اجر بہت زیادہ ہے۔۔۔ یہاں آ کر تم محسوس کرو گے کہ: تمہاری الم خیز سستی ایک شیریں ہمت اور لذیذ ولولے میں تبدیل ہو گئی ہے۔

سو اے میرے بے صبرے من!۔۔۔ تم تین طرح کے صبر کے مکلّف ہو:

ا۔ اطاعت پر صبر

ب۔ معصیت سے رکنے پر صبر

ج۔ مصیبت کے وقت صبر

اگر تم سمجھداری سے کام لو تو اس تنبیہ میں پائی جانے والی جلیل القدر حقیقت کو اپنا قائد بنا لو اور اس سے عبرت اور رہنمائی حاصل کرو، اور پورے اعتماد سے مردانہ وار کہہ دو: یا صبور. اور پھر صبر کی ان تینوں قسموں کی چلتی پھرتی تصویر بن جاؤ، اور صبر کی اس قوت سے مزیّن ہو جاؤ، اور اسی قوت پر اعتماد کرو جو تم میں ودیعت کر دی گئی ہے، اور یقین رکھو کہ یہ ایک ایسی قوت ہے کہ اگر اسے کسی غلطی سے ادھر ادھر کے کاموں میں بکھرنے نہیں دو گے تو یہ تمام مشقتوں اور آلام ومصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہو جائے گی۔

چوتھی تنبیہ: اے میرے اوچھے اور حواس باختہ من!

کیا خیال ہے کہ نماز جیسی بندگی کی ادائیگی بے نتیجہ اور بے فائدہ ہے؟ اور کیا اس کی اُجرت اتنی معمولی ہے کہ تم نے اس سے اکتانا شروع کر دیا ہے؟ جبکہ حالت یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کو اگر کوئی آدمی کچھ پیسوں کا لالچ دے کر یا ڈرا دھمکا کر کسی کام پر لگا دے تو کسی تھکاوٹ یا اکتاہٹ کا مظاہر کیے بغیر شام تک پوری محنت سے کام کرتا رہے گا!

بے شک وہ نماز جو اس عارضی مہمان سرا میں تمہارے اس عاجز، فقیر اور مسکین دل کے لیے قوت اور سکون کا باعث ہے، جو نماز تیرے اُس تاریک گھر یعنی قبر کے لیے غذا اور ضیا ہے جہاں تو عنقریب جا رہا ہے، جو اُس عدالت یعنی محشر کے لیے تمہاری برأت اور نجات کا پروانہ ہے جہاں تم عنقریب پیش کئے جاؤ گے، اور جو نماز تمہارے لیے اُس پل صراط پر روشنی اور بُراق بنے گی جس پر سے تمہیں بہرصورت گزرنا ہے۔۔۔ جس نماز کے یہ عظیم الشان نتائج ہیں کیا وہ بے نتیجہ اور بے فائدہ ہے؟ یا وہ معمولی اجرت کی حامل ہے؟

اگر کوئی آدمی تمہیں سو دن کام کرنے کے عوض سو ڈالر دینے کا وعدہ کرے تو تم اس کے اس وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے پوری مستعدی کے ساتھ کسی بھی تھکاوٹ یا اکتاہٹ کا اظہار کیے بغیر کام کرتے رہو گے، حالانکہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کر جائے، تو اس ذات کے بارے میں کیا خیال ہے جس نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے اور وہ وعدے کی کبھی بھی خلاف ورزی نہیں کرتا ہے؟ اس کے ہاں وعدہ کی خلاف ورزی محال ہے۔ اس نے تمہارے ساتھ ایک اجرت اور معاوضہ دینے کا وعدہ کیا ہے، اور وہ ہے جنت، اس نے تمہارے ساتھ تمہیں ابدی سعادت سے نوازنے کا وعدہ کیا ہے صرف ایک ایسا وظیفہ ادا کرنے کے بدلے میں جو انتہائی آسان، راحت بخش اور پر لطف ہے اور بہت تھوڑا وقت لیتا ہے۔ تم یہ سوچتے نہیں کہ اگر اس معمولی سے وظیفے اور چھوٹی سی خدمت کو سرانجام دینے کے لیے کمر بستہ نہ ہوئے، یا سرانجام تو دیا لیکن بے دلی سے اور تسلسل کے ساتھ نہیں، تو تم اس کے تحفے کی توہین کرو گے اور اس کے وعدے کو شک کی نظر سے دیکھو گے! تو کیا ایسی صورت میں اے جانِ من! تم تأدیب، گوشمالی اور سزا کے مستحق نہیں ٹھہرو گے؟ کیا جہنم جو کہ ایک ابدی قید خانہ ہے، اس کا خوف اس انتہائی، آسان اور لطیف وظیفہ کو ادا کرنے کے لیے تمہاری ہمت نہیں بندھاتا ہے؟ تمہیں برانگیختہ نہیں کرتا ہے؟ جبکہ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ تم دنیا کے اس قید خانے

کے خوف سے بڑے پر مشقت اور کمر توڑ کام بغیر کسی تھکاوٹ اور اکتاہٹ کے انجام دیتے ہو، دنیا کا یہ قید خانہ جہنم کے ابدی قید خانے کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟

پانچویں تنبیہ: اے میرے دنیا کے دیوانے من!۔۔۔ کیا تمہاری عبادت میں سستی اور کسلمندی اور نماز میں کوتاہی کا باعث تمہاری دنیاوی مصروفیات کی کثرت ہے؟ یا ہموم عیش کے غلبے کی وجہ سے تمہیں اس چیز کی فرصت نہیں ملتی ہے؟! بڑے تعجب کی بات ہے! کیا تم صرف اسی دنیا کے لیے پیدا کیے گئے ہو کہ اپنا تمام وقت اسی کے لیے صرف کر رہے ہو؟

غور کرو کہ! باوجود اس کے کہ تم فطری طور پر تمام جانداروں سے افضل ہو اور تم زندگی کے لوازمات کے حصول میں ایک چڑیا کے برابر بھی نہیں ہو سکتے ہو۔ اس سے تمہاری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ تمہاری اصل ذمہ داری جانوروں کی طرح دنیا میں انہماک اور اسی کے ساز وسامان کا اہتمام کرتے رہنا نہیں ہے، بلکہ حقیقی انسان کی طرح اس دائمی اور ابدی زندگی کے لئے تگ و دو کرنا ہے۔ اور پھر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ دنیا کی وہ مشغولیات و مصروفیات جو ہمہ وقت تمہارے پیش نظر رہتی اور تمہارے حافظے کے ساتھ چپکی رہتی ہیں، وہ لایعنی اور بیکار قسم کی مصروفیات ہیں، اور یہ وہ مصروفیات ہیں جن میں تم خواہ مخواہ دخل اندازی کر کے ایسی باتوں میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہو جن کی نہ کوئی قیمت ہے، نہ ضرورت ہے اور نہ ہی ان سے کوئی فائدہ حاصل ہونے والا ہے۔۔۔ مثال کے طور

پر یہ کہ امریکا میں پائی جانے والی مرغیوں کی کل تعداد کتنی ہے؟ یا یہ کہ زحل کے گرد کتنے دائرے ہیں وغیرہ۔۔۔ گویا کہ اس بات کا پتہ چل گیا تو تم ایک بہت بڑے ماہر حساب دان بن جاؤ گے یا فلک سے تمہیں کچھ حصہ مل جائے گا!! یوں تم زیادہ ضروری، زیادہ اہمیت والے اور زیادہ لازمی کاموں کو اس طرح چھوڑ دیتے ہو گویا کہ تمہیں اس دنیا میں ہزاروں برس جینا ہے!!

اگر آپ یہ کہیں کہ: نماز اور عبادت کے بارے میں میری سستی اور کمزوری کی وجہ یہ فضول باتیں نہیں ہیں بلکہ فکرِ معاش اور غمِ روزگار ہے، تو میں تمہیں ایک مثال سناتا ہوں:

اگر ایک آدمی کی یومیہ اجرت سو روپیہ ہو اور ایک شخص اسے کہے کہ: آؤ اور دس منٹ کے لیے یہاں سے زمین کھودو تمہیں یہاں سے ایک زمرّد ملے گا جو کہ سو (۱۰۰) ڈالر کی مالیت کا ہے۔ اب وہ آدمی یہ پیشکش یہ کہہ کر رد کر دے کہ میری سو روپے کی دیہاڑی ضائع ہو جائے گی اس لیے میں یہ کام نہیں کر سکتا، تو

اس کا یہ عذر کتنا فضول بلکہ کتنا بڑا پاگل پن ہوگا!۔۔۔

تمہاری حالت بھی یہی ہے، اگر تم فرض نماز چھوڑ دو گے، تو اس باغ میں تمہاری سعی وعمل کے تمام ثمرات بے کار کے دنیاوی نان نفقہ میں منحصر ہو جائیں گے اور تمہیں ان سے کوئی فائدہ یا برکت حاصل نہیں ہوگی، لیکن اگر تم سعی وعمل کے درمیان والے تفریحی وقفے نماز میں گزارو گے، جو کہ روح کی راحت اور دل کے سکون کا ایک بہت بڑا وسیلہ ہے، تو تمہارے اخروی نان نفقہ اور زادِ راہ کے ساتھ اس بابرکت دنیاوی نان نفقہ کو بھی ملا کر اُس چیز کا بھی اضافہ کر دیا جائے گا جو تم مندرجہ ذیل دو عظیم روحانی خزانوں کے سرچشمے سے حاصل کرو گے:

پہلا خزانہ: اس باغ میں تم نے خالص نیت کے ساتھ جتنی بھی نباتات، جڑی بوٹیاں اور پھل پھول تیار کیے ہیں وہ سب اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں، اور ان کی تسبیحات سے تمہیں حصہ وافر ملے گا۔(۱)

دوسرا خزانہ: تمہارے اس باغ کے پھلوں پھولوں سے جو بھی مستفید ہوگا خواہ وہ کوئی حیوان ہو، انسان، دوکان دار ہو یا چور، یہ سب تمہاری طرف سے صدقۂ جاریہ کے حکم میں ہوگا۔ جب تک کہ تمہارا نقطۂ نظر یہ ہو کہ گویا تم اللہ تعالیٰ کے مال کو اس کی مخلوقات میں بانٹنے کے لیے نمائندے اور ملازم مقرر کیے گئے ہو، یعنی تم اپنا ہر تصرف اس رازقِ حقیقی کے نام سے اور اس کی رضامندیوں کی روشنی میں کرو۔ اب ہم ذرا اس آدمی کا جائزہ لیتے ہیں جس نے نماز چھوڑ دی، یہ آدمی کتنے بڑے خسارے سے دوچار ہوا؟ اور وہ اتنی بڑی دولت وثروت سے کتنی بڑی محرومی کا شکار ہوا؟ اور کس طرح وہ ان دو دائمی اور ابدی خزانوں سے محروم اور نادار رہے گا جو انسان کو عمل کے لیے ایک عظیم روحانی قوت مہیا کرتے ہیں اور اس میں سعی ونشاط کا شوق پیدا کرتے ہیں؟!۔۔۔ حتیٰ کہ جب انسان بڑھاپے کی مایوس کن عمر کو پہنچ جائے گا تو بہت جلد اکتا جائے گا اور تنگ پڑ جائے گا اور اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہے گا: مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں خود کو تھکاتا پھروں؟ میں کس کے لیے کام کروں؟؛ کیونکہ میں تو کل کلاں اس دنیا سے کوچ کرنے والا ہوں!۔۔۔ اور اس طرح وہ خود کو کاہلی اور کسلمندی کی گود میں گرا دے گا۔ جبکہ پہلا آدمی خود کو مخاطب ہو کے کہتا ہے: میں اپنی اس روز افزوں عبادت کے پہلو بہ پہلو حلال کام کے لیے بھرپور محنت اور ان تھک تگ ودو کروں گا، تاکہ میں اپنی قبر کے لیے زیادہ سے زیادہ روشنی کا انتظام کر سکوں اور اپنی آخرت کے لیے زیادہ سے زیادہ ذخیرہ اندوزی کر سکوں۔

خلاصۂ کلام: اے میرے نفس یادرکھو کہ:۔۔۔گزراہوا کل تو تمہیں چھوڑ چکا، رہا آنے والا کل، تو وہ ابھی آیا نہیں، اور اگر آ بھی جائے گا تو تمہارے پاس اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ تمہارا ہوگا، اس لیے یہ یقین رکھو کہ فقط امروز ہے تیرا زمانہ۔ اور تمھاری حقیقی عمر آج کا دن ہی ہے۔ اس میں کم از کم یہ کرلو کہ اس کے چوبیس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹہ اُس صندوق میں ڈال لو جس مین آخرت کا ذخیرہ کیا جاتا ہے، اور وہ ہے مسجد یا مُصلّٰی، تا کہ تمہارے لیے حقیقی اور دائمی مستقبل کی ضمانت دی جاسکے، اور تمہیں اس بات کا بھی علم ہونا چاہیے کہ ہر نیا دن تمہارے اور دوسروں کے لیے ایک نئے عالَم کی طرف کھلنے والا دروازہ ہے۔ اور اگر تم نے اس دن میں نماز ادا نہ کی تو اس دن کا عالَم عالمُ الغیب کے ہاں تاریک، غمگین اور شکوہ کناں جائے گا اور تمہارے خلاف گواہی دے گا۔۔۔اور یہ کہ ہم میں سے ہر ایک کا اس عالَم کے متوازی اپنا ایک خاص عالَم ہے، یعنی ہم میں سے ہر انسان کی اپنی ایک الگ دنیا ہے، اور اس دنیا کا تانا بانا ہمارے عمل اور ہمارے دل سے بنتا ہے۔ اس کی مثال ایک آئینے کی طرح ہے کہ اس میں ہر تصویر اُس کے رنگ ڈھنگ کے مطابق ظاہر ہوتی ہے، آئینہ اگر زنگ آلود اور سیاہ ہوگا تو تو تصویر بھی سیاہ اور غیر واضح ہی نظر آئے گی۔۔۔اور اگر صیقل شدہ اور جلا دار ہوگا تو تصویر بالکل واضح نظر آئے گی، اور پھر اگر آئینہ ناہموار ہوگا تو تصویر بھی ناہموار، بھدی، بہت بڑی یا بہت چھوٹی نظر آئے گی۔۔۔تم بھی اے میری جان! ایسے ہی ہو، تم اپنے دل، عقل اور عمل کے ساتھ اپنی دنیا کی تصویروں میں تبدیلی لا سکتے ہو، یہ تمہارے ارادہ واختیار کا کرشمہ ہے کہ اس کائنات کو اپنے حق میں کرلو یا اپنے خلاف۔ بالکل اسی طرح تم جب نماز ادا کرو گے اور اپنی اس نماز کے ذریعے اپنا رخ اس عالم کے خالقِ ذوالجلال کی طرف کیے رکھو گے تو وہ عالم جس کا رخ تمہاری طرف ہے، اسی وقت جگمگا اٹھے گا، گویا کہ تم نے نماز کی نیت سے روشنی کا بٹن دبا دیا اور تمہاری نماز کے بلب نے اس عالم کو جگمگا دیا۔۔۔اس موقع پر تمہارے اردگرد دنیا کی جتنی پریشانیاں، بے تابیاں اور پراگندگیاں ہیں آن کی آن میں تبدیل ہوجائیں گی؛ کیونکہ روشنی ہوگئی ہے۔ اور تمہیں یہ ہموم وغموم اور آلائم ومصائب ایک پرحکمت نظام اور ایسے الفاظ وحروف نظر آئیں گے جو بڑے بامعنی، مفہوم دار اور پُرمغز ہیں، جو قدرتِ ربانی کے قلم سے لکھے گئے ہیں! تب تمہارے دل میں ﴿اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کی بے پناہ روشنیوں کا ایک کوندا در آئے گا، اس سے تمھارے اس دن کا وہ عالم روشن ہو جائے گا اور وہ اللہ کے ہاں اپنی نورانیت کے ذریعے تمہارے حق میں گواہی دے گا۔۔۔

خبردار میرے بھائی! یہ مت کہنا کہ: ایسی حقیقی نماز کے سامنے میری اس نماز کی بھلا کیا حقیقت ہے؟ کیونکہ جس طرح ایک معمولی سی گٹھلی کے اندر ایک مکمل کھجور کا تار و پود چھپا ہوا ہوتا ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ یہ اجمالی کھجور ہے اور وہ تفصیلی۔-اسی طرح میرے اور آپ جیسے عام لوگوں کی نماز میں اس نور کا ایک حصہ اور اس حقیقت کے اسرار و رموز کی ایک رمز ہوتی ہے۔اور یہ حصہ اور یہ رمز ہمارے تمہارے جیسے لوگوں کی نمازوں میں بھی ایسے ہی ہوتی ہے جیسے بڑے بڑے اولیائے کرام کی نمازوں میں ہوتی ہے۔یہ اور بات ہے کہ ہمیں اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔البتہ یہ ضرور ہے کہ اس نماز کی نورانیت کے درجات مختلف ہیں، بالکل ایسے جیسے کھجور کی گٹھلی سے لے کر مکمل درخت بننے تک کے درجات و مراتب میں تفاوت پایا جاتا ہے، اور قطع نظر اس سے کہ نماز کے درجات و مراتب بہت زیادہ ہیں، ان تمام کے تمام مراتب میں وہ نورانی حقیقت اساسی طور پر موجود ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى مَنْ قَالَ: (اَلصَّلاةُ عِمَادُ الدِّيْن) وَعَلٰى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِيْن.

مرقدِ انور حضرت مولانا فخر الدین فخرِ جہاں دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

خانقاہِ معلیٰ حضرت قبلۂ عالم خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ، مہار شریف (ضلع بہاولنگر)

سالانہ عرس مبارک حضرت مولانا محمد الدین مکھڈی رحمۃ اللہ علیہ کی محفلِ پاک کا ایک روح پرور منظر